Scanned with CamScanner

۲۹ واں شمارہ

باسمہٖ تعالیٰ شانہٗ

اللطیف

زیرِ حمایت و سرپرستی

شیخ المشائخ اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین شاہ محمد باقر صاحب قادری

دام برکاتہم العالی سجادہ نشینِ خانقاہِ حضرت قطب ویلور

مدیر مؤسس

حضرت اقدس مولانا ابو الحسن صدر الدین شاہ سید محمد طاہر قادری علیہ الرحمۃ

سابق ناظم دار العلوم لطیفیہ ویلور

تاریخ اجراء

برموقعۂ جلسۂ تقسیم اسناد ۔ ۹ شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ م 25 فروری 1991ء دوشنبہ

زیرِ نگرانی

مولانا مولوی سیدہ شاہ عثمان پاشاہ صاحب قادری عرف فصیح پاشاہ بی کام (عثمانیہ)

ادیب فاضل (مدراس) ناظم دارالعلوم لطیفیہ

مولانا مولوی سیدہ شاہ ہلال احمد صاحب قادری عرف ہلال پاشاہ صاحب۔

نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ

زیرِ ادارت

مولانا مولوی پی محمد ابوبکر صاحب ملیباری لطیفی قادری مدرس دارالعلوم لطیفیہ

مولانا مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قریشی قادری ادھونی استاذ دارالعلوم لطیفیہ

نمائندگانِ طلباء

مولوی پی محی الدین پاشاہ بی کوتہ کوٹہ ۔۔۔ متعلم زمرۂ مولوی عالم

ین۔ ابراھیم خان پاکھالہ ۔۔۔ متعلم جماعتِ ششم

وی۔ پی۔ دانیال کاوش آمبور ۔۔۔ " " "

حافظ شیخ فرید الدین کلے کونٹہ ۔۔۔ متعلم شعبۂ حفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرستِ مضامین سالنامۂ اللطیف سنہ ۱۴۱۱ھجری

رباعیاتِ امجد
توبہ
جب اپنی خطاؤں پہ میں شرماتا ہوں
اک خاص سرور قلب میں پاتا ہوں
توبہ کرتا ہوں جب گنہ سے امجد
پہلے سے زیادہ پاک ہو جاتا ہوں
مآلِ مال
جمعیتِ مال و زر میں حکمت کیا ہے
تکلیف کی اس جمع میں راحت کیا ہے
دولت حاصل تو کی بڑی محنت سے
یہ کہیے اب حاصلِ دولت کیا ہے
مقصودِ زندگی
ہر دم رہیں ذکرِ حضرتِ باری میں
دن رات گزاریں گریہ و زاری میں
مقصود یہی ہے زندگی کا امجد
مصروف رہیں موت کی تیاری میں

غزل

از: قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین
شیخ المشائخ حضرت رکن الدین
سید شاہ ابوالحسن قادری المتخلص بہ قربی
ویلوری رحمۃ اللہ علیہ
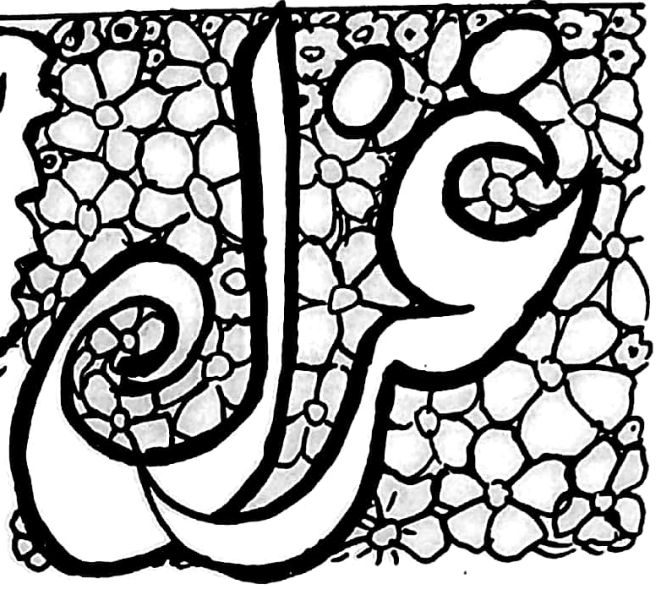
پیشکش: مولانا سید شاہ ہلال احمد صاحب رضا قادری
المعروف بہ ہلال پاشاہ نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

خمِ وحدت سوں پی مدام شراب — اس کے نشہ میں بوج جگ کو سراب

جب ہے تاخیر میں بہوت آفات — جرعہ نوشی میں نہ کی کر تو شتاب

مے کے پینے سے مت کرو پرہیز — اِتَّقُوا اللّٰہَ یَا اُولِی الْاَلْبَاب

ہر ذرّہ وجہ ذات ہے بے شک — عاشقاں کے رموز کو دریاب

بحرِ وحدت کے خلق ہیں امواج — عینِ امواج کیا ہے تو بوج آب

ہے حقیقت کی راہ میں ذکر اللہ — جو کہ کرتا ہے تارِ تارِ رباب

لاعمل میں جو عاشقاں بولے — طرق العشق کُلّہا آداب

بولنے کو ترانۂ توحید! — تن ہی طنبور ہے زباں مضراب

کر سب اسبابِ عشق آمادہ — کر توں تاراج زہد کے اسباب

حال کا نفع ہات میں لانے — بوج قالِ صحیح اصل نصاب

علم ظاہر ہے پوست کے مانند — علم باللہ جان لبِّ لباب

نہ کی قربی نماز کرنے کوں
او پری یار دل کا ہے محراب

آج عالمِ اسلام جس قدر اضطراب اور بے چینی کی لپیٹ میں آچکا ہے، یہ کوئی مستور حقیقت اور ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مسلمان خواہ کسی ملک اور کسی علاقہ کے ہوں وہ متفرق و مختلف اور گوناگوں مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے تیزی کے ساتھ بدلتی ہوی سائنسی اور صنعتی دنیا میں قوت و طاقت جمع نہ کی اور اس میں اضافہ نہیں کیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ ایک ایسی بھیانک اور خطرناک صورت حال سے دوچار ہوجائیں جس پر قابو پانے کے لیے ایک طویل وقت گزر جائے۔ قرآنِ کریم نے ہدایت دی ہے

واعدّوا لهم ما استطعتم من قوة

اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت و صیانت اور رفعت و سربلندی کے لیے جہاں تک ہوسکے قوت و طاقت جمع کرو۔ اس مقام پر قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ وحیٔ محمدی نے قوت کی توضیح اور تشریح کرنے کے بجائے اس کو مجملاً بیان کردیا ہے۔ کیوں کہ قوت و طاقت کا معیار ہر دور میں ہمیشہ یکساں اور ایک ہی حالت میں نہیں رہتا ہے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ زمانہ کی قوت اور وقت کی طاقت کو پہچانتے ہوئے طاقت و قوت پیدا کریں۔

بلاشبہ آج وقت کی سب سے بڑی طاقت و قوت سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت اور تجارت ہے جن کی ضرورت و اہمیت اور افادیت سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے تین چیزوں کا اپنانا نہایت ضروری ہے۔ ان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اسلام سے ہمارا رشتہ قوی اور مضبوط کرلیا جائے۔ اور بالخصوص ہماری نئی پود اور جدید نسل کو دین کے بنیادی عقائد اور ضروری تعلیمات سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے تاکہ اس کے دل و دماغ اور روح پر اسلام کی ایسی گہری چھاپ پڑجائے کہ وہ ساری زندگی مٹ نہ سکے۔

ولا تموتن الا وانتم مسلمون

امام غزالیؒ نے بڑی بصیرت افروز بات کہی ہے۔ بچے کو اس کے ابتدائی دور ہی میں عقائدِ

ذہن نشین کر دینا چاہیے۔ اس کی عمر کے ساتھ ساتھ اس پر ان کے معانی منکشف ہو جائیں گے۔ ابتدا یاد سے ہونی چاہیے۔ پھر سمجھ اور فہم آجائے گی۔ اس کے بعد اعتقاد، ایقان اور تصدیق کی منزل ہوگی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام کے اس عظیم مفکر کی اس انمول اور بیش بہا نصیحت کو آج مسیحی قوم نے قبول کر لیا ہے اور دنیا بھر کے ملکوں میں وسیع پیمانہ پر تعلیمی اور تربیتی مراکز کا جال بچھا دیا ہے تاکہ بچوں کے دل دماغ کو اوائل عمر ہی سے اپنے منشا اور مقصد کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

اور ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جب تک ملّت کے افراد میں ایمانی شعور، دینی احساس، مذہبی حمیت اور اسلامی غیرت موجود نہ ہو تو اس وقت تک صحیح معنوں میں اسلام سے وابستگی قائم نہیں ہو سکتی اور اسلام سے علاحدگی اور کنارہ کشی کی صورت میں ہماری کوئی ترقی بھی نہیں ہو سکتی۔

ایک موقع پر خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے اہل عرب سے خطاب کرتے ہوئے یہ تاکید کی تھی:

اعزکم اللہ بالاسلام فمہما تطلبوا بغیرہ یذلکم اللہ

اللہ نے تمہیں اسلام کی بدولت عزت دی ہے۔ جب کبھی تم اسلام کو پس پشت ڈال کر کوئی ترقی کرنا چاہو گے تو خدا تمہیں ذلیل کر دے گا۔

حضرت عمرؓ کے اس حکیمانہ قول پر تاریخ نے مہر تصدیق ثبت کر دی اور جب کبھی مسلمانوں نے اسلام کو پس پشت ڈال دیا تو عروج و اقبال اور نیک بختی و فیروز مندی بھی ان سے منہ موڑ لیا۔

لہذا ہمارا اولین اقدام، مطمع نظر اور مطلوب و مقصود اسلام ہی ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہی دنیاوی ترقی کی سمت قدم اٹھانا چاہیے۔

اسلامی ذہن کی تشکیل و ساخت کے ساتھ دوسری چیز جس کا اپنانا وقت کی شدید ترین ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم و فنون میں کامل دسترس اور مہارت تامہ پیدا کریں ان کے بغیر ایجادات و انکشافات سے بھری دنیا میں ہمارا کوئی مقام متعین نہیں ہو سکتا اور اسلام نے کسی ایسے علم و فن کو جو زندگی کے لیے ضروری ہے اور اس کی افادیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، شجر ممنوعہ نہیں قرار دیا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایک دور ایسا بھی آیا جس میں انھوں نے علوم و فنون کے باب میں قائدانہ کردار ادا کیا اور ان کے علمی و تحقیقی سرمایہ سے دوسری قومیں استفادہ کرنے لگیں۔ ایک معاصر صاحب قلم تحریر فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک دنیا میں وہی حیثیت حاصل رہی جو آج روس یا امریکہ کو حاصل ہے۔ اس وقت جب کہ یوروپ پر ابھی قرون مظلمہ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، عرب مسلمان ایک شاندار تہذیب کو وجود میں لاچکے تھے اور اپنی تحقیقات اور یونانی اور دوسرے علوم کے کے ترجموں کی مدد سے سائنس اور فلسفہ میں دنیا کی امامت کر رہے تھے۔ اس وقت مسلمان ساری ساری دنیا میں علم اور تہذیب کے تنہا مالک تھے۔ عربی زبان دنیا کی واحد علمی زبان تھی اور ساری دنیا کے لوگ علوم وفنون کے اکتساب کے لیے مسلم مرکزوں (دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ) کا اسی طرح سفر کرتے تھے جیسے آج لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جاتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کے بعد کئی سو سال ایسے گزرے ہیں جب مسلمان ساری دنیا میں علم طب کے امام تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ مسلم اطباء سے رجوع کرتے تھے۔ اور طب میں مسلمانوں کی تصنیفات ہر جگہ فن طب کا ماخذ بنی ہوئی تھیں۔ یورپ کا سب سے پہلا میڈیکل کالج سلرنو (اٹلی) میں قائم ہوا۔ یہ میڈیکل کالج گیارھویں صدی عیسوی میں قائم ہوا تھا۔ اس کا نصاب بڑی حد تک ان طبّی کتابوں پر مشتمل تھا جو عربی زبان سے لاطینی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔"

پروفیسر ہٹّی نے اس سلسلہ میں مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الزہراوی کتاب "التعریف لمن اعجز عن التالیف" کا سرجری سے متعلق حصّہ گیرارڈ آف کریمونا نے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف ایڈیشن چھپے۔ وینس میں 1497ء بیسل میں 1541ء میں، آکسفورڈ میں 1778ء میں یہ ترجمہ صدیوں تک سلرنو اور مونٹ پیلیر اور دوسرے یورپی طبّی اداروں میں نصاب تعلیم کا جز بنا رہا۔

جغرافیہ ایک بے حد اہم سائنس ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے بے شمار شعبوں سے ہے۔ دورِ اول کے مسلمانوں نے اس فن میں بھی کمال پیدا کیا۔ مثال کے طور پر الادریسی اپنے زمانے میں دنیا کا سب سے بڑا جغرافیائی عالم تھا۔ پروفیسر فلپ ہٹّی نے اس کی بابت لکھا ہے:

قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا اور ممتاز جغرافیہ داں الادریسی کے زمانہ میں راجر دوّم سسلی کا بادشاہ تھا۔ اس کو ایک جغرافیائی نقشہ کی ضرورت تھی تو اس کو یہ نقشہ جس نے بناکر دیا وہ یہی الادریسی تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا 1984ء کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ الادریسی نے 1154ء میں

سسلی کے مسیحی حکمراں راجر دوم کے لیے ایک عالمی نقشہ بنا کر دیا اس میں ایشیائی علاقوں کی زیادہ بہتر معلومات دی گئی تھیں جو اس وقت تک بھی انسان کو حاصل نہ ہوی تھیں۔

واسکوڈی گاما ایک پرتگالی ملاح تھا اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے 1497ء میں ہندوستان اور یورپ کے درمیان سمندری راستہ دریافت کیا جو کیپ آف گڈ ہوپ (راس امید) ہوکر جاتا تھا۔ مگر یہ عظیم کامیابی اس کو ایک عرب ملاح احمد بن ماجد کے ذریعہ حاصل ہوی۔

برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ واسکوڈی گاما جب پرتگال سے چل کر آفریقہ پہنچا تو وہاں موزنبیق کے سلطان نے واسکوڈی گاما کو دو مسلم ملاح دیے۔ ان میں سے ایک اس وقت بھاگ گیا جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ پرتگالی مسیحی مذہب کے ہیں۔ جس جہاز راں نے واسکو ڈی گاما کا ساتھ دیا اس کا نام احمد بن ماجد تھا وہ نہایت ماہر تھا اور سمندری جہاز رانی سے اتنی واقفیت رکھتا تھا کہ اس پر اس نے اہم کتاب لکھی ہے۔

پروفیسر ایچ۔ ڈبلیو۔ سی ڈیوس نے اپنی کتاب "قرونِ وسطیٰ کا انگلستان" میں انگلستان کے ایک قدیم سنہرے سکہ کی تصویر اس کے دونوں رخ سے چھاپی ہے۔ یہ سکہ برٹش میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ تصویر میں واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ سکہ کے ایک طرف عربی رسم الخط میں کلمۂ شہادت لکھا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف اس وقت کے انگلستان کے بادشاہ اوفاریکس کا نام کندہ ہے۔ اسی کے ساتھ سکہ پر بغداد کے مسلمان سکہ گر کا نام بھی درج ہے۔ سکہ کی تصویر کے نیچے پروفیسر ڈیوس نے لکھا ہے، "قدیم انگلستان کے سونے کا سکہ جو 774ء میں ڈھالا گیا۔ جس میں ایک عرب دینار کی نقل کی گئی ہے۔ یہ ایک تاریخی شہادت ہے جو بتاتی ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان صنعتی ترقی کے اس مقام پر تھے کہ انگلستان کے نامور بادشاہ اوفاریکس وفات 796ء کو ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ وہ اپنے ملک کا سکہ ڈھالنے کے لیے بغداد کے مسلم ماہرین کو بلائے۔ اس وقت انگلستان میں جو سکہ ڈھالا گیا وہ مسلم ممالک کے سکے دینار کی نقل تھا۔"

مسلمانوں کے اس شاندار ماضی کی ہلکی پھلکی سی جھلک پیش کرنے سے ہمارا منشا اور مقصد صرف یہی ہے کہ اب وقت آچکا ہے کہ ہم بھی اپنے اسلاف کی طرح موجودہ عہد کی سائنس و ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت اور دیگر علوم وفنون میں قدم آگے بڑھائیں۔ ورنہ اس برق رفتار زمانہ میں ہماری کوئی انفرادی حیثیت برقرار نہ رہ سکے گی اور علم وفن اور حکمت تو مسلمان کے لیے ایک گم شدہ خزانے کی طرح ہے اور

یہ نعمت اس کو جہاں کہیں اور جس سے بھی ملے اس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی اور غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

اس مقام پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ علوم و فنون کی تحصیل اور تکمیل اور ان میں ترقی و کمال کا رشتہ معاشی خوش حالی اور اقتصادی آسودگی سے جڑا ہوا ہے۔ اور اقتصادیات اور معاشیات میں ترقی اور بالادستی حاصل کرنے کا راز تجارت میں مضمر ہے اسی لیے اسلام نے اپنے متبعین کو تجارت کی ترغیب وتحریص دلائی اور اللہ کے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تجارت کی اور صاف الفاظ میں مسلمانوں سے کہا تسعة اعشار فی الرزق التجارة ۔ نوے فی صد رزق تجارت میں موجود ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ عہد میں پیغمبر اسلام کے اس قول و فعل کو جاپانی قوم نے قبول کرلیا ہے اور وہ ایلکٹرانکس اور دوسرے شعبوں میں اس قدر عمدہ اور اعلیٰ مصنوعات تیار کر رہی ہے کہ ساری دنیا اس کی بنائی ہوی چیزوں کو خرید رہی ہے۔

اور تیسری چیز جو آج مسلمانوں کے لیے انتہائی ضروری اور لازمی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی اختلافات اور معاشرتی تنازعات کو وسعت نظری اور خلوص والفت کے ساتھ ختم کردیں۔ بے شک نظریاتی اختلافات اور معاشرتی تنازعات کو کسی سوسائٹی سے کلیتہً ختم نہیں کیا جاسکتا لیکن وقت اور حالات کے مدنظر ان کی لو مدھم کی جاسکتی ہے۔

اس کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہر مسلک کے پیروکار اپنے موقف پر جس کو وہ برحق تصوّر کرتے ہیں، قائم رہ کر اپنے نظریات اور عقائد کو کتاب و سنت اور تعامل صحابہؓ کی روشنی میں مثبت انداز میں پیش کریں جو کہ ہر مسلک اور موقف کے خطا و صواب ہونے کا صحیح معیار ہے۔ اور دوسروں کے موقف کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے غلط و گمراہ قرار دینے اور اپنے موقف کی طرف داری کی نظر سے دیکھتے ہوئے صحیح و صواب قرار دینے کی روش سے احتراز کریں فربکم اعلم بمن هو اهدیٰ سبیلا اور آپس میں ہونے والی معاشرتی زیادتیوں اور معاملاتی ناانصافیوں پر انتقامی کارروائیوں سے اجتناب کریں۔ فاصلحوا بین اخوایکم مسلکی رواداری اور باہمی خیرخواہی کی صورت میں مسلمان غیر اسلامی قوتوں کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوی دیوار کی طرح مضبوط اور مستحکم ٹھہر سکتے ہیں۔ اور اپنی تعمیر و ترقی کی طرف گامزن رہ سکتے ہیں۔ اختلافات کی فضا میں ہر مسلمان کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے

نقش قدم پر چلنا چاہیے کہ کس طرح انہوں نے خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اختلاف کے باوجود اتحاد کی عجیب و غریب مثال قائم کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جس میں ان دونوں بزرگوں کے درمیان لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ قسطنطنیہ کی عیسائی حکومت اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ایران کے شمالی حصہ پر حملہ کا ارادہ کیا، جو مملکتِ مرتضوی کی قلمرو میں شامل تھا۔ قسطنطنیہ کے حکام نے یہ سمجھ لیا کہ اس وقت حضرت علیؓ اندرونی خلفشار اور مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں اور ان کی توجّہ اور قوت کا رُخ اُن کے حریف حضرت معاویہؓ کی جانب ہے۔ اس صورت میں ہم آسانی کے ساتھ شمالی ایران پر قابض ہو سکتے ہیں اور حضرت معاویہؓ بھی ہماری چڑھائی اور حملہ سے خاموش اور غیر جانبدار رہیں گے۔ قیصر روم کے ان ناپاک ارادوں کی خبر جوں ہی حضرت معاویہؓ کو ملی تو انھوں نے قسطنطنیہ کے حکمرانوں کو ایک مکتوب روانہ کیا جس میں تحریر کیا کہ تم ہمارے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اسلامی مملکت پر حملہ کرنا چاہتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت علیؓ کی قیادت میں جو لشکر تمہارے مقابلہ کے لیے نکلے گا معاویہؓ اس لشکر کا ادنیٰ سپاہی ہوگا۔

اتحاد کے اس مظاہرہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیصر روم مملکتِ مرتضوی پر فوج کشی سے باز رہا۔ اور عالم اسلام ایک بھیانک تباہی اور بڑی ہلاکت سے محفوظ رہا۔

مسلمانوں کے باہمی اختلافات میں اتحاد کی ایک روشن مثال یہ تھی اور اس کے برعکس دوسری مثال یہ ہے کہ جس زمانہ میں سلطان ناصرالدین اللہ خلافتِ بغداد کی مسند پر فائز تھا اور سلطان علاء الدین محمد بن خوارزم شاہ خراساں کے علاقہ پر حکمران تھا۔ اس نے خلیفۂ بغداد کا خطبہ موقوف کر دیا اور عراق پر حملہ کر دیا اور اس کے ایک حصہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب یہ خبر خلیفۂ بغداد کو ملی تو اس نے خوارزم شاہ کی طاقت توڑنے کے لیے قدم اٹھایا کہ تاتاری قوم کو خفیہ مکتوب روانہ کیا۔ جس میں تاتاریوں کو خوارزم شاہ کے ملک پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ جس کے نتیجہ میں تاتاریوں نے خوارزم شاہ پر حملہ کر دیا اور اس کی سلطنت کو ختم کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد تاتاریوں کے حوصلے بلند ہوئے اور انھیں اپنی بڑھتی ہوی قوت کا احساس ہوا۔ تو چنگیز خان کی قیادت میں ناصرالدین اللہ کی سلطنت کی طرف متوجہ ہوے اور مرکزِ خلافت ہی پر حملہ آور ہو گئے اور ایسی خوں ریزی اور تباہی برپا کی جس سے سارا عالَم اسلام لرز اٹھا۔

تاریخ نے اپنے دامن میں اتحاد اور عدم اتحاد کے دونوں واقعات اور ان کے نتائج وثمرات کو جگہ دی اور رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کو تنبیہ اور آگاہ کردیا کہ وہ جو چاہیں روش اختیار کریں ۔

حاصل کلام! عصر حاضر میں ہماری آنے والی نسل کی ذہنی و دینی تربیت طاقت و قوت کا حصول ، اقتصادیات و معاشیات میں ترقی و بالادستی ، جدید و مفید علوم و فنون میں کمال اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ ہی وقت کی اہم ترین تقاضہ ہے جس سے تغافل و تساہل اور کوتاہ دستی کوئی دانش مندانہ اقدام نہ ہوگا اور تاریخ ہماری اس غفلت کو کبھی معاف نہیں کرے گی ۔

وما علینا الا البلاغ

روئداد دارالعلوم لطیفیہ

ادارہ

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے ہر دور میں مخالف طاقتوں نے اسلام کے خلاف صف آرائیاں کیں، اور چاہا کہ دنیا سے اسلام ختم ہو جائے۔ ابتداءً شرک کی کالی گھٹاؤں نے چاہا کہ ہر طرف اندھیرا چھا جائے۔ اور ہمیشہ کے لیے نورِ اسلام ماند پڑ جائے لیکن ہر جگہ ہر حال میں کامرانی و فیروزمندی نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔

مخالفین نے شیدایانِ اسلام کو دنیا کی بڑی سے بڑی دولتیں پیش کر کے چاہا کہ وہ اسلام سے پھر جائیں۔ لیکن اللہ کے دیوانے ساری چیزوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اور انھوں نے ذرا بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ چناں چہ تاریخ اسلام میں ایسی بے شمار ہستیاں وجود میں آئیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ انھی ہستیوں میں سے اقطابِ ویلور قدس اسرارہم بھی ہیں جنھوں نے حق گوئی و بے باکی کے ساتھ اسلام کی خدمت کی اور آج بھی ان بزرگوں کا تحریری سرمایہ ملّت کے لیے سرچشمۂ حیات ہے۔

نیا سال

بارہ شوال المکرم سنہ ۱۴۱۰ھ سے دارالعلوم لطیفیہ، مکانِ حضرت قطبِ ویلور قدس سرہ العزیز کا نیا تعلیمی سال شروع ہوا۔

اس سال بھی جدید طلبا کی کثیر درخواستوں کی وجہ سے داخلہ میں توسیع کر دی گئی۔ مربیانِ دارالعلوم نے اپنے بلند عزائم اور حوصلہ مندی سے ملّت کے نونہالوں کو اس سرچشمۂ علوم سے اپنی پیاس بجھانے کا زرین موقع عطا فرمایا۔

افتتاحی اجلاس

حسبِ معمول اس سال بھی انجمنِ دائرۃ المعارف کا سالانہ افتتاحی اجلاس بزیرِ صدارت عالی جناب مولانا مولوی سید شاہ عثمان پاشاہ قادری عرف فصیح پاشہ صاحب ایم اے، ناظم دارالعلوم لطیفیہ، مکان حضرت قطب ویلور مورخہ بروز پیر، ۱۷ ذی قعدہ سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۱ جون ۱۹۹۰ء دن کے تین بجے منعقد ہوا۔

جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآنِ کریم اور نعتِ رسول پاکؐ سے ہوا۔ دارالعلوم کی دیرینہ روایات کے مطابق اس سال بھی ایک خصوصی خطیب کو مدعو کیا گیا۔ جن کا اسمِ گرامی مولانا مولوی ابوالسعید سید شاہ عبدالجبار صاحب قادری ناظمِ جامعۃ العلوم الثنائیہ، کڑپہ ہے۔ موصوف نے بہت ہی جامع اور بلیغ انداز میں طلباء دارالعلوم سے خطاب فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ:

یہ مدرسہ ساداتِ کرام اور خاندانِ اہلِ بیت کا ہے خدا کی مدد اور بزرگانِ حضرت مکان کی یہ زندہ کرامت ہے کہ مدرسہ اپنے اسلاف اور مشائخ کی روایات کو قائم اور باقی رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ اس دورِ پرفتن کی مسموم فضا میں محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ جو طلبا اس دارالعلوم سے اکتسابِ علم کرتے ہیں وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔ انھیں دنیا و دین کی لازوال دولت حاصل ہوتی ہے اور بزرگانِ مکان کی ارواحِ مقدسہ کی توجہات ان کے حال پہ مبذول ہوا کرتی ہیں۔ اس طرح وہ انوار و برکات اور تصرفات کے سایہ میں عروج و ترقی کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں

اس کے بعد ناظمِ دارالعلوم سید شاہ عثمان پاشاہ صاحب قادری ایم اے، نے اپنے اثر آفریں انداز میں طلبا کو خطاب فرمایا۔ اور مہمانِ خصوصی اور دیگر شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا۔

درسی امتحانات

مورخہ ۲۲ ربیع الاول سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق 3 اکتوبر ۱۹۹۰ء بروز شنبہ ششماہی امتحانات اساتذۂ کرام کی زیرِ نگرانی اور ۲۷ رجب المرجب سنہ ۱۴۱۱ھ سے دارالعلوم کے سالانہ امتحانات شروع ہوئے اور ایک ہفتہ تک جاری رہے۔

انجمن کے مخصوص جلسے

۵ ربیع الاول سنہ ۱۴۱۱ھ بروز یکشنبہ جلسۂ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ربیع الثانی بروز منگل شب میں جلسۂ سیرتِ سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بزیرِ صدارت عالی جناب مولانا

سیدہ عثمان پاشاہ صاحب قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ، مکانِ حضرت قطبؒ ویلور منعقد ہوا۔ جس میں طلبائے عزیز و اساتذۂ کرام اور حضرت ناظم صاحب نے اپنی بصیرت افروز تقاریر سے بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم و غوثیت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

دارالتصنیف والاشاعۃ

اس سال بھی سالنامۂ اللطیف میں کئی ایک علمی و تحقیقی مضامین اور تراجم منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز کی تصنیف فصل الخطاب بین الخطاء والصواب کے چند فوائد کا ترجمہ اور آپ کے علمی و اصلاحی مکتوبات کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ نیز حضرتِ ذوقی قدس اللہ سرہ کے قصائد، حضرت شاہ حیدر ولی اللہؒ کی کتاب خوارقِ حیدریہ کے کچھ مضامین تشریح و ترجمہ کے ساتھ پیش کئے جارہے ہیں۔

مدیرانِ مسئول، مضمون نگار حضرات اور مولانا مولوی سید شاہ عبدالجبار صاحب قادری جنھوں نے فصل الخطاب کے ترجمہ کی تصحیح فرمائی اور جناب محمد شریف برکاتی آمبور جنھوں نے کتابت کی اور جناب سید علیم الدین علیم صبا نویدی، مدراس، جنھوں نے اپنی نگرانی میں طباعت کا کام انجام دیا ادارہ ان تمام مخلصین کا سپاس گزار ہے۔

اسبابِ صحت

دارالعلوم میں تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ دماغی فرحت اور جسمانی راحت کے اسباب بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ چناں چہ طلبا روزانہ شام کے وقت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد والی بال ٹینی کائٹ، بیاڈمنٹن، کبڈی وغیرہ مختلف گیمس سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

نویدِ مسرت

بحمداللہ! امسال بھی مدراس یونیورسٹی کے امتحانات میں اکثر طلبا نے شرکت کی اور انھیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

عباپوشی و اعطائے اسناد

بزیرِ صدارت فضیلت مآب اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہٗ العالی، سجادہ نشین، مکانِ حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز، مورخہ ۹ رشعبان المعظم ۱۴۱۱ھ روز پیر دارالعلوم کا سالانہ اجلاس وسیع پیمانے پر منعقد ہوا۔ جس میں قابل قدر علمائے کرام اور قابل ترین حضرات مدعو تھے۔ اعلیٰ حضرت قبلہ مدظلہ العالی نے

اپنے دستِ مبارک سے فارغین کو عبا اور اسناد عطا فرمایا۔

تقسیم انعامات

اسی دن شام میں ایک دوسری نشست منعقد ہوئی، جس میں درسیات، مقالہ نویسی، تقریر وتحریر اور گیمس واسپورٹس میں اول، دوم درجہ میں آنے والے طلبا کو قیمتی انعامات سے نوازا گیا نیز عہدیدران کو ان کی خدمات کے صلہ میں مختلف قسم کے انعامات سے نوازا گیا۔

ہدیۂ تشکر

ہم ان اطبا ر ڈاکٹر حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے موسمی اثرات سے متاثر ہونے والے طلبا پر خصوصی توجہ فرمائی اور نہایت ہمدردی کے ساتھ ان کا علاج ومعالجہ فرمایا۔

نیز ادارہ ان تمام مدیرانِ اخبار کا تہِ دل سے مشکور ہے جو اولین فرصت میں دارالعلوم کی کارروائیوں کو نمایاں طور پہ شائع فرماتے رہے۔

ھم اللہ رب العزت
سے دست بدعا ہیں کہ
وہ ان تمام
عقیدت مندانِ دارالعلوم کو
دارین کی
سعادت نصیب فرمائے!
آمین ثم آمین۔!!

جلسۂ استقبالیہ

کیرالہ کی مشہور و معروف، متحرک وفعّال اور علمی و دینی شخصیت کاندپورم اے۔ پی۔ مولوی ابوبکر بن احمد ناظر، مرکز الثقافۃ السنیۃ کارو ندر کالی کٹ و جنرل سکریٹری سمستہ کیرالا جمعیۃ العلماء اپنے رفقا واحباب مولانا مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، مولانا سید علی با فقیہ تنگل اور مولانا سید فضل پوکو یا تنگل ممبر آف وقف بورڈ، کیرالا کے ہمراہ دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور تشریف لائے تاکہ اعلیٰ حضرت قبلہ مدظلہٗ، ناظم صاحب واساتذہ دارالعلوم کو اپنی تعلیمی وصنعتی درس گاہ مرکز الثقافۃ السنیۃ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے مدعو کیا جائے موصوف روز اتوار بعد نماز عصر حضرت مکان آ پہنچے تو مولانا سید شاہ عثمان صاحب قادری عرف فصیح پاشاہ صاحب، ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے خیر مقدم کیا اور تمام حضرات کرام اعلیٰ حضرت قبلہ کی نشست گاہ پر تشریف لائے۔ سلام و دست بوسی کے بعد بیٹھ گئے۔ اساتذۂ دارالعلوم لطیفیہ کا تعارف ہوا۔ اور مختلف دلچسپ اور مفید باتیں ہوتی رہیں۔ تمام حضرات چائے نوشی سے فارغ ہونے کے بعد بزرگانِ حضرت مکان کی مزارات پر تشریف لے گئے اور فاتحہ پڑھی۔ نمازِ مغرب سے فارغ ہونے کے بعد مولانا سید شاہ ہلال احمد صاحب قادری، نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے تمام مہمانوں کو دارالعلوم کا قدیم و تاریخی کتب خانہ کا معائنہ کروایا۔ اس کے بعد ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے کی قرأت اور نعت کے بعد دارالعلوم لطیفیہ کے استاذ مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قادری نے استقبالیہ تقریر کی۔ جس میں موصوف نے کیرالا کے اس علمی و دینی وفد کی آمد پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور وفد کو اس تاریخی اور مقدس مقام سے روشناس کرانے کے خیال سے دارالعلوم لطیفیہ اور خانقاہ کی تین سو سالہ تاریخ اور اس کے اکابرین بالخصوص مجددِ جنوب حضرت قطب ویلور کی علمی اور اصلاحی تحریک پر مختصراً روشنی ڈالی۔

اس کے بعد مولوی شاہ الحمید صاحب کیرالا کے وفد کا مفصل تعارف کروایا۔ تعارفی تقاریر کے بعد معزز مہمانوں کی گل پوشی عمل میں آئی جس کے بعد مولوی ابوبکر بن احمد ناظر، مرکز الثقافۃ

السنیہ مائک پر تشریف لائے اور ایک طویل خطاب فرمایا۔ جس میں موصوف نے اعلیٰ حضرت قبلہ سے شرفِ ملاقات اور اس علمی درس گاہ اور تاریخی خانقاہ میں حاضری کو سعادت قرار دیا۔ اور تشکر وامتنان کے جذبات کا اظہار کیا۔ اور اہلِ سنّت وجماعت کی تشریح اور اس کے مبنی بر صواب ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہی وہ واحد جماعت ہے جو کتاب و سنّت اور طریق صحابہ کو اختیار کی ہوئی ہے اور یہی آخرت میں نجات پانے والی ہے۔ اصل چیز عقیدہ ہے اس کے بعد ہی عمل کا درجہ ہے۔ آج عمل پہ تو زور دیا جا رہا ہے لیکن عقیدہ جو بنیادی چیز ہے اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ سنت وجماعت کے عقائد کو عام کیا جائے۔ دورانِ خطاب موصوف نے آثارِ نبوی، میلاد النبی، توسل و استغاثہ اور زیارتِ نبوی وغیرہ جیسے مسائل پہ مدلل روشنی ڈالی اور طلبا کو نصیحت کی کہ موجودہ تحریکات کے دور میں اہلِ سنّت کے مسلک کی ترویج اور اختلافی مسائل میں اعتدال اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔

موصوف کی مادری زبان ملیالم ہے تاہم انہوں نے اردو میں بہت ہی عمدہ تقریر کی بیچ بیچ میں عربی زبان کا سہارا لیا تاکہ مافی الضمیر کو بحسن وخوبی ادا کر سکے۔ موصوف کے خطاب کے بعد مولانا سید شاہ عثمان صاحب قادری، ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے مختصر اور جامع تقریر کی جس میں انہوں نے طلبا کو نصیحت کی کہ فاضل مہمان مقرر کی باتوں کو آویزۂ گوش بنالیں۔ اپنی تقریر کے اختتام پر اعلیٰ حضرت قبلہ مدظلہٗ اساتذہ وطلبا کی جانب سے تمام مہمانوں اور دیگر حاضرین جلسہ کی خدمت میں ہدیۂ سپاس پیش کیا۔

بارگاہِ نبوی میں صلاۃ وسلام کے بعد دعا پر جلسہ ختم ہوا جس کے بعد ایک پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام ہوا اور تمام مہمان ضیافت سے فارغ ہونے کے بعد تشریف لے گئے۔

بقیہ صـ 167 کا: علمائے کرام کا مقام ومرتبہ) اپنے شاگردوں سے مشورہ مناظرہ اور گفتگو کرتے اور ان سے پوچھتے نیز جو احادیث وآثار شاگردوں کے پاس رہتے ان کو سنتے اور جو آپ کو معلوم ہوتے وہ پیش فرماتے شاگرد امام صاحب سے مہینہ مہینہ بھر ردوبدل اور مناظرہ کرتے کہ آخر کسی ایک بات پر تحقیق ہوتی تو اس کو امام ابو یوسفؒ سے لکھوا دیتے۔ اس طرح حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ نے مسائل فقہ کی تدوین کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور علم فقہ ایک مستقل ایک فن کی شکل اختیار کر گیا اس معنی اور لحاظ سے آپ کی ذاتِ گرامی کو فقہ کا بانی حضرات میں شامل کیا جائے تو کچھ بعید بات نہ ہوگی۔ علم اور علماء کا مقام کتاب وسنّت سے بخوبی واضح کر دیا گیا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ علم کی قدر کی جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے۔ وما علینا الا البلاغ ●●

از حافظ ابو النعمان شاہ محمد بشیر الحق قادری ۔ استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

مذکورہ آیات میں صنفی مواصلت کے بغیر فرشتہ کی زبان سے بچہ کی ولادت کی خبر سُن کر حضرت مریمؑ کا حیران اور پریشان ہوجانا اور پیکرِ عفت وعصمت، غیر شادی شدہ کنواری لڑکی کی گود میں نوزائیدہ بچہ کو پاکر سارے لوگوں کا حیرت واستعجاب میں پڑ جانا اور نومولود کا کلام فرماکر اپنی ماں کی پاکدامنی اور برأت کا اعلان واظہار کرنا ۔ یہ وہ امور ہیں جو اس بات کی رہ نمائی کر رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت معجزانہ طور پر بغیر باپ کے ہوی۔ قرآن کریم میں ایک مقام پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے مثل اور مشابہ قرار دیا گیا ہے ۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔ (سورۂ آل عمران)

بے شک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام کی مثال جیسی ہے کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا پھر ان کے قالب کو حکم دیا کہ جاندار ہوجا پس وہ جاندار ہوگئے ۔

اس کے علاوہ ام المومنین حضرت ام سلمہ کی وہ روداد بھی مطالعہ کے قابل ہے، جو انھوں نے ہجرت حبشہ اور دربار نجاشی سے متعلق بیان کی ہے اس کی روشنی میں بھی حضرت مریم کا کنوارا پن، حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور ان کا انسان، رسول، روح اور کلمۃ اللہ ہونا ثابت ہے ۔ یہ بیان قدرے طویل ہے لیکن اس کے مطالعہ سے بہت سی باتیں سامنے آتی

ہیں۔ جو فائدے سے خالی نہیں ہیں۔ چناں چہ فرماتی ہیں:

"قریش کے یہ دونوں حضرات (عبد اللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن عاص) ماہر سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیانِ سلطنت کو خوب ہدیے تقسیم کرکے سب کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے نجاشی پر بالاتفاق زور دیں گے پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادان بھاگ کر آپ کے ہاں آگئے ہیں اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے۔ ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ ایسے لوگوں کو ضرور واپس کردینا چاہیے۔ ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انھیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ: اس طرح تو میں انھیں حوالے نہیں کروں گا جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے، ان سے میں بے وفائی نہیں کرسکتا۔ پہلے میں انھیں بلاکر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔

چناں چہ نجاشی نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ نجاشی کا پیغام پاکر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے ہم تو وہی بے کم و کاست پیش کریں گے۔ خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا:

یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنے قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے نہ دنیا کے دوسرے ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمہارا نیا دین کیا ہے؟

اس پر مہاجرین کی طرف سے حضرت جعفر ابنِ ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی جس میں پہلے عرب جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا۔ پھر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کرکے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں۔ پھر ان مظالم کا ذکر کیا جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے۔ اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ: دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک

کا رُخ اس امید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔

نجاشی نے یہ تقریر سُن کر کہا:

ذرا مجھے وہ کلام تو سناؤ، جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمہارے نبیؐ پر اترا ہے۔

جعفر رضی اللہ عنہٗ نے جواب میں سورۂ مریم کی وہ ابتدائی آیتیں سنائیں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہیں۔

نجاشی اس کو سُنتا رہا اور روتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہٗ نے تلاوت ختم کی تو اُس نے کہا کہ یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے دونوں ایک ہی سر چشمہ سے نکلے ہیں۔ خدا کی قسم میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا۔

دوسرے روز عمرو بن عاص نے نجاشی سے کہا کہ ذرا ان لوگوں کو بلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟ یہ لوگ اُن علیہ السلام کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں۔

نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے سے عمرو بن عاص کی چال کا علم ہوچکا تھا۔ انہوں نے جمع ہوکر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دوگے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے۔ ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمایا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا۔

چناں چہ جب یہ لوگ دربار میں گئے تو نجاشی نے عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال اُن کے سامنے دھرایا تو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہٗ نے اٹھ کر بلا تامل کہا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کلمہ ہیں۔ جسے اللہ نے کنواری مریمؑ پر القا کیا۔

نجاشی نے سُن کر ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور کہا:

خدا کی قسم! جو کچھ تم نے کہا، عیسیٰ علیہ السلام اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔

اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام ہدیہ یہ کہہ کر واپس کردیے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محیر العقول و تحیّر انگیز ولادت اور ان کی معجزانہ شخصیت اور اُن سے صدور پذیر معجزات کے باعث حیرت خیز

حالات رونما ہو گئے۔ کچھ افراد نے ان کی بزرگی و عظمت اور تقدس و احترام کے جذبات سے سرشار ہو کر انھیں الوہیت کا مقام اور ابن اللہ کا درجہ دے دیا تو کچھ اشخاص نے ان کی تحقیر و تذلیل اور عداوت و عناد کے جذبے سے مغلوب ہو کر انھیں ناجائز اولاد قرار دے دیا۔ اور ان کے خون کے پیاسے ہو گئے اور بالآخر انھیں سولی چڑھائے بغیر سکون و قرار نہ پا سکے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی کے حالات اور واقعات سے متعلق قرآنِ کریم میں واضح تصریحات موجود نہیں ہیں۔ البتہ سورۂ المومنون کی ایک مختصر سی آیت میں ایک مجمل اشارہ ملتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اور ان کی والدہ کی سکونت اور بود و باش کے لیے ایک سرسبز و شاداب مقام عطا فرمایا: چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

وجعلنا ابن مریم وامه اٰیة واٰوینٰهما الیٰ ربوة ذات قرار ومعین

اور اسی طرح ابن مریمؑ یعنی مسیح اور ان کی ماں کو اپنی سچائی کی ایک بڑی نشانی بنایا اور انھیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھی۔

مرتفع مقام سے متعلق مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد وادیٔ نیل کی بالائی سطح یعنی مصر کا بالائی حصہ ہے۔ اسی شاداب علاقہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن اور شباب گزرا اور جوانی کی عمر میں فلسطین واپس لوٹ آئے۔

اور انجیل متی (۲ – ۱۳ تا ۲۳) کے بیان کے مطابق حضرت مریم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ان کی حفاظت کے لیے دو مرتبہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئیں۔

پہلے ہیرودیس بادشاہ کے عہد میں وہ انھیں مصر لے گئیں اور اس کی موت تک وہیں رہیں۔ پھر ارخلاؤس کے عہدِ حکومت میں ان کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی۔

اور حضرت وهب بن منبہ کے ایک بیان سے جو تاریخ ابنِ کثیر، جلدِ دوم میں محفوظ ہے اس سے بھی حضرت عیسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات اور آپؑ کے تعلق سے اس وقت کے ایک یہودی بادشاہ ہیرودلیس اور اس کے رفقاء و مصاحب کے خیالات و احساسات اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔

"جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا اور روشن ستارہ دیکھا۔ بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس

کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے۔ جو ملکِ شام میں پیدا ہوئی ہے۔

تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملکِ شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں۔

وفد جب شام پہنچا تو اس نے تفتیشِ حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ۔ جو مستقبلِ قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا۔

یہود نے اہلِ فارس کی زبان سے یہ کلمات سُنے تو اپنے بادشاہ ہیرودلیس کو خبر کی۔ بادشاہ نے وفد کو دربار میں بلا کر استصوابِ حال کیا اور ان کی زبانی واقعہ کو سُن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچّہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔

پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اول اُن کو سجدۂ تعظیم کیا۔ پھر مختلف خوشبوئیں اُن پہ نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا۔

دورانِ قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودلیس اس بچہ کا دشمن ہوگا۔ اس لیے تم اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرت مریم علیہ السلام کو اپنا خواب سُناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کا بادشاہ ہیرودلیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لے جاکر رکھو جو اس کی دسترس سے باہر ہو اس مشورہ کے بعد حضرت مریم علیہ السلام حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں۔ اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں۔ اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو اُن کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں "

حلیۂ مبارک

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل و صورت، خدوخال، اور حلیہ و سراپا کا ایک واضح خاکہ احادیثِ نبویؐ میں موجود ہے۔

معراج کے موقعہ پہ نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی۔ اور ایک مرتبہ انھیں اپنے خواب میں بھی دیکھا

ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے مسیح ابنِ مریم علیہ السلام کو دیکھنے اور ملاقات کرنے کا واقعہ کو عالمِ بیداری کے واقعہ ہی پر محمول کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کے خواب اور بیداری کا مسئلہ دیگر انسانوں کے خواب و بیداری کا مسئلہ نہیں ہے اور آپ ﷺ کی صرف آنکھیں سوتی ہیں اور قلبِ مبارک بیدار اور ہشیار رہتا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنام عینہ ولا ینام قلبہ :

(بخاری ص ۲۵۱ : ج 1)

اور معراج کے موقعہ پہ سارے انبیاء کرام جسم وروح کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ ملاقات کے لیے آ پہنچے تھے۔ چناں چہ بخاری شریف کے حاشیہ میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں موجود ہے :

استشکل رؤیۃ الانبیاء فی السموٰت مع ان اجسادھم مستقرۃ فی قبورھم واحضرت اجسادھم لملاقاتہ صلی اللہ علیہ وسلم ذلک اللیلۃ تشریفاً وتکویماً لہ

(بخاری ص ۵۴۹)

لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کردہ سراپائے مسیحی فی الحقیقت وہی ہے جس سے حضرت مسیح علیہ السلام متصف ہیں۔

ذیل کی حدیثیں ملاحظہ ہوں :

عن ابی ھریرۃ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اُسری بی . . . . . ولقیت عیسٰی فنعتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ربعۃ احمر کانّہ خرج من دیماس یعنی الحمام (بخاری: ص: ۴۸۹)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میں نے شبِ معراج میں حضرت عیسٰی علیہ السلام سے ملاقات کی۔ وہ سُرخ رنگ اور میانہ قد کے آدمی ہیں۔ چہرہ کی رنگت، تروتازگی اور شگفتگی کا یہ عالم نظر آیا کہ وہ ابھی ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں۔

عن ابن عمر قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم رأیت عیسٰی . . . . فامّا عیسٰی فاحمر جعدٌ عریض الصدر

(بخاری: ص ۴۸۹)

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دیکھا وہ سرخ رنگ گھنگھریالے زلف اور کشادہ سینہ کے مالک ہیں۔

قال عبداللہ بن عمر ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم . . . . . ارانی اللیلۃ عند الکعبۃ فی المنام فاذا رجل آدم کاحسن

ما تریٰ من ادم الرجال تضرب لِمّتہ بین منکبیہ رجل الشعر یقطر رأسہ ماءً واضعاً یدیہ علی منکبی رجلین دھو یطوف بالبیت فقلت من ھذا۔ فقالوا ھذا المسیح ابن مریم۔ (بخاری: ص ۴۸۹)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا کہ مجھے خواب دکھلایا گیا کہ میں کعبہ کے پاس ہوں ۔ اچانک گندمی رنگ کا ایک آدمی دکھائی دیا جو بہت ہی حسین وجمیل ہے ۔ گندمی رنگ کے آدمیوں میں اس سے زیادہ حسین نہیں دیکھا گیا ۔ اس کے زلف کندھوں پر کان کی لو تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ سر کے بالوں سے پانی کے قطرات ٹپکتے دکھائی دے رہے ہیں ۔ (یعنی وہ شخص شگفتگی، شادابی اور تازگی سے آراستہ نظر آرہا ہے ۔) دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے ۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے ؟ تو بتلایا گیا یہ مسیح ابن مریم ہیں ۔

معجزاتِ مسیحی

اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو معجزات کی نعمت سے بہرور فرمایا ۔ جن کے صدور وظہور میں خدا کی حکمتیں، مصلحتیں اور مشیّتیں کارفرما رہا کرتی تھیں ۔ ان میں سے ایک اہم حکمت یہ رہتی تھی کہ ظاہر بین اشخاص اور افراد اسباب و علل سے عاری، عادت کے خلاف اور عقل و فہم سے ماوریٰ، حیرت انگیز معجزات کو دیکھیں تو اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان وایقان مضبوط ومستحکم ہو سکے ۔ اور وہ نبی کی نبوّت کی تصدیق کر سکیں ۔ چناں چہ ایمان وتصدیق کی صورت میں یہ معجزات انسانوں کے لیے زندگی اور رحمت ثابت ہوتے تو کفر وانکار کی صورت میں موت و ہلاکت کا باعث ہوا کرتے تھے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف اور متعدد معجزات سے سرفراز فرمایا اور خود اُن کی ذاتِ اقدس ہی کو بے باپ کے پیدا فرماکر ایک عظیم معجزہ قرار دیا تاکہ وہ اس کی قدرت کا انمول اور نادر المثال نمونہ قرار پا سکیں ۔

معجزاتِ مسیحؑ نے ان دلوں کو تو نور اور روشنی عطا کیا ۔ جن میں صالح فطرت کی بوباس موجود رہی ۔ اور وہ ایمان کی سعادت وفضیلت سے مستفیض ہوئے اور جن دلوں پر ظلمت و تیرگی کا پردہ پڑا ہوا تھا وہ افراط وتفریط کے بھنور میں جا گرے ۔ اور مسیحؑ کی شخصیت کے باب میں غلو وتعصب اور تعظیم وتحقیر کے انتہا پسندانہ موقف پر جا ٹھہرے ۔ اس سلسلہ میں

وحیٔ محمدیؐ کی یہ تصریحات ہیں:

- وقالت النصاریٰ المسیح ابن اللّٰہ (التوبہ)

نصاریٰ نے کہا کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا ہے۔

- لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ ھو المسیح ابن مریم (المائدہ)۔

یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ مسیح ابنِ مریم ہی خدا ہے۔

- فلما جاءھم بالبینٰت قالوا ھذا سحر مبین۔ (الصف)

جب مسیح اُن کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آ پہنچے تو انہوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں صدور پذیر معجزات میں سے یہ ہیں کہ آپ بچپن ہی میں گہوارہ میں کلام کیا کرتے تھے۔ اور مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا تھا۔ اور کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے تھے۔ اور مُردوں کو جِلا دیتے تھے۔

قرآن کریم میں سورۂ مائدہ میں آپ کے معجزات کی تفصیل اس طرح وارد ہے۔

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی وتبری الاکمہ والابرص باذنی واذ تخرج الموتیٰ باذنی۔

اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے مٹی لیتے اور پرندے کی شکل جیسی چیز بناتے پھر اس میں پھونک مارتے اور وہ میرے حکم سے ایک پرندہ ہو جاتا۔

اور تم میرے حکم سے اندھے اور برص کے بیمار کو چنگا کر دیتے اور تم میرے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتے۔

—— جاری ——

مولوی حافظ ابو النعمان شاہ محمد بشیر الحق قادری۔ استاذِ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

ذیل میں چند احادیث پیش کی جارہی ہیں جن میں زوجین
کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں سے متعلق روشنی ہے

ایک مسلمان مرد اور عورت کی زندگی کا ایک اہم
ترین دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ وہ نکاح کے
مقدس بندھن کے ذریعہ قرب واتصال اور یکجائی سے
ہم کنار ہوتے ہیں۔ زبانِ نبوتؐ نے اس مرحلہ کو تکمیلِ
ایمان قرار دیا: من نکح فقد استکمل الایمان
جس شخص نے عقد کیا پس اس نے ایمان مکمل کیا اور
اسی ازدواجی رشتہ کے ساتھ ان دونوں پر ایک دوسرے
کے حقوق اور فرائض عاید ہوجاتے ہیں۔ اور ان کے
علاوہ نئے خاندان کی تشکیل اور اولاد کی دینی ودنیاوی
تعلیم اور ان کے اخلاق وعادات کی نگہداشت وتربیت
اور ان کے معاش و معاد کی فلاح وبہبودی کی ذمہ
داری بھی آپڑتی ہے۔ جس کو حسن وخوبی کے ساتھ پورا
کرنے کی صورت میں صالح اولاد، صالح خاندان اور
صالح معاشرہ کا قیام ممکن ہے۔ اس سلسلہ میں نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا مطالعہ کیجیے جن
میں مردوں کو اپنی بیویوں کے ساتھ خیر وبھلائی، خوش کلامی
اور ان کے ساتھ صبر وتسامح اور عفو ودرگزر اور نسوانی
کمزوریوں اور صنفی خصلتوں کی رعایت ولحاظ اور
گالی گلوچ، نفرت وحقارت سے پرہیز اور حتی الامکان
پند ونصیحت کرنے کی ترغیب اور تحریص موجود ہے
اور عورتوں کو اپنے شوہروں کی طاعت وفرماں برداری
اور ان کی امانت کی حفاظت اور ان کی خواہشات کی
تکمیل واحترام اور استطاعت کی حدود میں ان کے
حکم پر کاربند رہنے اور ان کی اجازت کے بغیر گھروں
سے باہر نہ نکلنے اور نفل روزے رکھنے کی ممانعت موجود
ہے اور ان دونوں یعنی میاں اور بیوی پر اولاد کی تعلیم و

تربیت اور ان کی زندگی کا حق نہ چھینے اور انھیں صالح بنانے کی ترغیب و تعلیم موجود ہے۔

• عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایفرک مومن مومنۃ ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر۔

رواہ مسلم: فی کتاب الرضاع (باب الوصیۃ بالنساء)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ بغض وعناد اور نفرت وحقارت نہ رکھے اگر اس کی کوئی خصلت وعادت قابلِ کراہت ہے تو اس کے اندر دوسری کوئی خصلت وعادت موجود رہے گی جس سے مرد راضی اور خوش ہوگا۔

اس حدیث سے یہ روشنی ملتی ہے کہ بیوی کی کسی ایک ناپسندیدہ خصلت کو دیکھتے ہوئے اس کی کسی ناپسندیدہ عادت کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

• عن معاویۃ بن حیدۃ رضی اللہ عنہ قال قلت یارسول اللہ ماحق زوجۃ احدنا علیہ؟ قال ان تطعمھا اذا طعمت وتکسوھا اذا اکتسیت، ولا تضرب الوجہ، ولا تقبح و لا تھجر الا فی البیت۔

معاویہ بن حیدہ رضی سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا کہ ہمارے اوپر اپنی بیوی کا حق کیا ہے؟ ارشاد مبارک ہوا کہ جب تم کھاؤ تو انھیں بھی کھلاؤ، جب تم پہنو تو انھیں بھی پہناؤ۔ اس کے چہرہ پہ طمانچہ نہ مارو، بُرا نہ کہو اور اس کو ہمیشہ اپنے گھر ہی میں رکھو۔

امام ابوداؤد کو کتاب النکاح میں "حق المرأۃ علی زوجھا" کے باب میں درج کیا ہے اور لا تقبح کا معنی یہ بتلایا لا تقل قبحك اللہ اپنی بیوی کو قبحك اللہ نہ کہو۔ اللہ تیرا برا کرے۔

اس حدیث میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیوی کو مارنا، پیٹنا منع ہے اور اس کو دوسروں کے گھروں میں چھوڑنا منع ہے اور جب اس سے نافرمانی اور عدم طاعت کا ظہور ہو تو اس کو تنبیہ اور ادب سکھلانے کے خیال سے اس کی خوابگاہ سے علاحدگی اختیار کرنا چاہیے۔

• عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم خلقا وخیارکم لنسائھم۔

ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومنوں میں کامل ترین مومن وہ ہے جس کے اخلاق نیک ہوں اور تم میں بہترین اشخاص وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں نیک اور بہتر ہوں۔

اس حدیث کو امام ترمذی نے "کتاب النکاح" باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجھا میں نقل کیا ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حدیث

صحیح اور حسن ہے۔

ارشاد نبویؐ کا منشا اور مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کشادہ رو و خندہ جبیں رہے اور اس کو کسی بھی طرح کی تکلیف دینے سے اجتناب کرے اور اس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک سے پیش آئے اور اگر اس کی جانب سے ناروا قول و فعل کا صدور ہو تو صبر اور عفو سے کام لے۔

حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:
حسن اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی خیر اور بھلائی پھیلائے اور مردم آزاری سے بچے اور ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور حسن سلوک سے پیش آئے۔

● عن عبد اللہ بن عمرو العاص رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ۔ (رواہ مسلم)

عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: دنیا ایک متاع اور پونجی ہے اور دنیا کی بہترین پونجی نیک طینت اور صالح بیوی ہے۔

اس حدیث میں ایک مسلمان کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ نیک اور صالح عورت کو اپنی شریک حیات بنائے۔ کیوں کہ ایسی بیوی شوہر کے لیے سعادت و خوش بختی کا ذریعہ ہے اور وہ امور نیک میں معاون و مددگار بنتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نیک عورت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے۔ إذا نظر الیہا سرتہ، وإذا أمرها أطاعتہ وإذا غاب عنها حفظتہ فی نفسها ومالہ (رواہ ابو داؤد)

جب شوہر اس کی جانب دیکھے تو اس کو خوش کرے اور جب اس کو کسی کام کا حکم دے تو اس کو پورا کرے اور شوہر کی غیر حاضری میں اپنے نفس اور آبرو کی حفاظت کرے اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔

ولزوجك علیك حق: (بخاری)
تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔ یہ ایک طویل حدیث کا اقتباس ہے۔ ایک عابد و زاہد اور شب بیدار و عبادت گزار صحابی تھے جو اپنی بیوی کی جانب توجہ نہیں دیتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حال کا علم ہوا تو آپؐ نے یہ نصیحت فرمائی کہ بیوی کا حق بھی ادا کرو۔

● عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دعا الرجل امرأتہ الی فراشہ فلم تأتہ فبات غضبان علیہا لعنتہا الملائکۃ حتی تصبح۔ (متفق علیہ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ شوہر جب بیوی کو اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے مدعو کرے اور وہ انکار کردے اور شوہر ناراضگی کے

عالم میں رات گزار دے تو ملائکہ عورت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ صبح نمودار ہوجائے۔

اس حدیث کی روایت امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے کی ہے۔ اس متفق علیہ حدیث سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ عورت کے لیے شرعی عذر نہ ہو اور طبیعت بھی درست ہو تو ایسی صورت میں شوہر کی خواہش کی تکمیل واجب ہے۔ کیوں کہ بیوی کا اعراض اور انکار شوہر کے گناہ و معصیت میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔

● عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: قال لا یحل لامراۃ ان تصوم وزوجھا شاھد الا باذنہ ولا تأذن فی بیتہ الا باذنہ:

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بیوی کے لیے جائز نہیں کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ رکھے جب کہ خاوند شہر میں مقیم ہو۔ اور شوہر کی اجازت کے بغیر کسی شخص کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دے۔

اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب النکاح میں اور امام مسلم نے کتاب الزکاۃ میں درج کیا ہے۔ مذکورہ حدیث میں روزہ رکھنے کی جو ممانعت وارد ہے اس سے مراد نفل روزہ ہے۔

● عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: کلکم راع وکلکم مسؤل عن رعیتہ والامیر راع والرجل راع علی اھل بیتہ والمرأۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وولدہ فکلکم راع وکلکم مسؤل عن رعیتہ۔ (متفق علیہ)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کے ماتحت افراد سے متعلق پوچھا جائے گا کہ ان کے حقوق کو ادا کیا ہے یا نہیں؟ حاکم کو اس کی رعایا سے متعلق پوچھا جائے گا، آدمی کو اس کے اہل و عیال سے متعلق دریافت کیا جائے گا اور عورت کو اس کے شوہر اور اس کے گھر اور اس کی اولاد سے متعلق پوچھا جائے گا۔

اس حدیث کو امام مسلم نے باب فضیلۃ الامام العادل میں نقل کیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہورہی ہے کہ مسلم معاشرہ کا ہر فرد عنداللہ مسئولیت سے دوچار ہوگا اور ہر ایک کو اس اس کی ذمہ داری سے متعلق پوچھ گچھ ہوگی اور حقوق کی ادائیگی اور فرائض کی تکمیل کی صورت میں اجر و ثواب سے مستفیض ہوگا ورنہ عذاب میں گرفتار ہوگا۔

● عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لو کنت امراً احداً ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

اس حدیث کی روایت امام ترمذی نے کی ہے اور اس کے متعلق یہ تصریح فرمائی ہے کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

اس حدیث میں بیوی پر شوہر کے حق کی رعایت اور اس پر اپنے شوہر کی اطاعت واجب ہونے کی واضح دلیل موجود ہے نیز اس مسئلہ کی وضاحت بھی کی ہے سجدہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں۔

- عن ام سلمة رضی اللہ عنها قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ایما امراة ماتت وزوجها عنها راض دخلت الجنة - (رواہ ترمذی)

ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بھی عورت اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئی کہ اس کا شوہر اس سے راضی خوشی تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔

- عن جابر بن سمرة قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لان یودب الرجل ولده خیر من ان یتصدق بصاع وعن جده ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال ما نحل والد ولدًا من نحل افضل من ادب حسن۔

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: باپ کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے ایک باپ اپنی اولاد کو اس سے بہتر کوئی عطیہ اور تحفہ نہیں دے سکتا کہ وہ ان کو اچھی تعلیم و تربیت دے۔

اس حدیث کو امام ترمذی نے کتاب الصلۃ والبر میں باب ماجاء فی ادب الولد میں نقل کیا ہے۔ یہ حدیث بتلاتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اولاد کی دینی، مذہبی تعلیم کی طرف کس قدر توجہ دینی چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تمہاری اولاد بولنے لگے تو اس کو لا الہ الا اللہ سکھا دو۔ پھر مت پروا کرو کہ کب انتقال کر جائے اور جب دودھ کے دانت گر جائیں تو نماز کا حکم دو۔

اس حدیث میں دو اہم اور ضروری باتوں کی جانب اشارہ ہے ایک یہ ہے کہ تمہاری اولاد کو لا الہ الا اللہ سکھا دو۔ اس کا مطلب صرف کلمۂ توحید کے ظاہری الفاظ سکھا دینا نہیں ہے بلکہ دین کے بنیادی عقائد حفظ کرا دینا اور دین

کے ضروری امور سکھا دینا ہے تاکہ عہدِ طفولیت میں سکھائی ہوئی باتیں ساری زندگی ذہن میں مستحضر رہ سکیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔ بچہ کو اس کے اوائل عمر میں دین کے عقائد حفظ کرا دینا چاہیے عمر جیسے جیسے بڑھتی جائے گی اس میں فہم آجائے گی اور حفظ کردہ عقائد کے معانی و مطالب اس پر منکشف ہوجائیں گے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایمان و ایقان میں مضبوطی اور پختگی بھی پیدا ہوجائے گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ دانت گر جائیں تو نماز کا حکم دو۔ اس حکم کا وسیع تر مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اولاد کو اوائل عمر ہی سے دین کے احکام پر عمل کرنے کی عادت ڈالو تاکہ وہ ساری زندگی شرعی احکام پر عمل کرنے کی خوگر رہے۔

• عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عال جارتین حتی تبلغا جاء یوم القیامۃ انا وھو وضم اصابعہ کھاتین

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ سنِ تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا مقام ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوے ہوں گے۔

• عن عائشۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ عنھا قالت جاءتنی امراۃ ومعھا ابنتان لھا تسألنی فلم تجد عندی شیأ غیر تمرۃ واحدۃ فاعطیتھا ایاھا فاخذتھا فقسمتھا بین ابنتیھا ولم تاکل منھا شیأ ثم قامت فخرجت وابنتاھا فدخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحدثتہ حدیثھا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ابتلی من البنات بشئ فاحسن الیھن کن لہ ستراً من النار۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت اپنی دو بچیوں کو لیے میرے پاس آئی اور اس نے کچھ مانگا۔ اس وقت میرے نزدیک صرف ایک ہی کھجور تھا۔ وہ میں نے اس کو دے دیا۔ اس عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور اپنی دونوں بچیوں کو کھلا دیا۔ اور خود نہ کھائی۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اپنی بچیوں کو لے کر نکل گئی۔ اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے۔ میں نے آپؐ کو یہ سارا ماجرا سنایا۔ آپؐ نے سُن کر ارشاد فرمایا: جو کوئی لڑکیوں کی مصیبت میں مبتلا ہو اور پھر ان کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالیں گے۔

وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائیں گی۔

موخر الذکر دونوں حدیثوں کو امام مسلم نے کتاب البر والصلۃ میں باب فضل الاحسان الی البنات میں نقل کیا ہے۔ جن سے لڑکیوں کی پرورش اور ان سے پیش آنے والے مسائل کو پورا کرنے اور اُن کے ساتھ حسن سلوک اور رحم و کرم کرنے کی ترغیب موجود ہے۔

حاصل کلام! ان احادیث کے مطالعہ سے چند امور کی جانب نشاندھی ہوتی ہے جن کا مختصر خلاصہ چند لفظوں میں ادا کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ شوہر کو بیوی پر فوقیت اور بالادستی کا درجہ حاصل ہے اور شوہر پر فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کھلائے، پلائے، پہنائے، اوڑھوائے اور اس کے ساتھ الفت و محبت، خوش گفتاری اور خوش خلقی سے پیش آئے۔ اور اس کی جانب سے کوئی ناروا قول و فعل صادر ہو تو عفو و درگزر اور تسامح سے کام لے۔ اور بیوی اپنے شوھر کی اطاعت گذار، وفا شعار اور فرماں بردار رہے۔

اور شوہر کے مال و دولت اور ملکیت کی حفاظت کرے اور اپنی عزت و آبرو اور نفس کی حفاظت کرے اور عورت کے لیے جنّت شوہر کی رضا و خوشنودی میں رکھی گئی ہے۔

اولاد کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت والدین کا فرض ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے ساتھ احسان و فضل اور رحم و کرم کا سلوک کرنے سے آخرت میں والدین کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب اور جنّت کی نعمتیں میسر ہوں گی اور جو والدین لڑکیوں اور ان سے پیدا ہونے یا پیش آنے والے مسائل و امور سے آزمائے جائیں گے۔ وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں گے۔ اور عورت و مرد ہر دو سے ان ان سے متعلق فرائض کی ادائیگی کے بارے میں آخرت میں سوال کیا جائے گا۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تصنیف

مجدد جنوبی ہند سلطان المرشدین

حضرت علامہ شاہ محی الدین سید عبد اللطیف قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہ

ترجمہ و تلخیص

مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری ادھونی

استاذ دار العلوم لطیفیہ ویلور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلہ دِ جنوب عضرت قطب ویلور علیہ الرحمۃ کی معرکۃ الآراء تصنیف فصل الخطاب کی موجودہ دسویں قسط درج ذیل موضوعات اور مباحث پر مشتمل ہے۔ ان میں اکثر بحثیں اختلافی ہیں جن میں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے خود ایک معتدل موقف اختیار کیا ہے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہے اور کتاب کے مقدمہ میں اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ یہ کتاب ان اشخاص کے لیے مفید ہے جو لوگوں کو غلو، تشدد اور تعصب سے واقف ہیں۔ اور مصنف نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اختلافی مسائل میں ایک ہی جانب کے حق ہونے کا یقین کر لینا اور دوسرے جانب کو باطل قرار دینا یہ رویہ غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہے

ہمیں امید ہے کہ قارئینِ "اللطیف" کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہو گی۔

وما علینا الا البلاغ !

مترجم:
ابو النعمان غفرلہ

۱۔ حکمِ قیام۔
۲۔ سلام، مصافحہ اور معانقہ کا حکم۔
۳۔ قدم بوسی کا حکم۔
۴۔ زمین چومنے اور زمین پر رخسار یا جبین رکھنے اور سجدہ کرنے کا حکم۔
۵۔ خالق کے ساتھ صحبت کا حکم
۶۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص وآداب۔
۷۔ اہلِ بیت یعنی ساداتِ کرام کے حقوق وآداب۔
۸۔ مرشدِ کامل کے حقوق وآداب۔
۹۔ آدابِ عالِم۔

۱۰۔ آدابِ متعلم۔

۱۱۔ والدین کے ساتھ فرزند کے آداب۔

۱۲۔ بھائیوں اور دوستوں کی صحبت کے آداب۔

۱۳۔ مجہول اشخاص کی صحبت کے آداب۔

۱۴۔ لوگوں کے ساتھ صحبت کے آداب۔

۱۵۔ سلام جو سنّتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

۱۶۔ تصوّف وصوفی اور ان دونوں کے متعلقات۔

۱۷۔ صوفیاء کے ساتھ مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے اختلافات۔

حکمِ قیام

باہمی دوستی اور صحبت اختیار کرنے کے آداب اور اُن کے متعلقات صحبت کے آداب بہت ہیں۔ اور اس کے ثمرات و نتائج بے شمار ہیں۔ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حجۃ اللہ البالغہ" میں آدابِ صحبت کی بحث میں فرماتے ہیں:

واضح ہو کہ منجملہ ان امور کے جن کو فطرتِ سلیمہ اور افرادِ انسان میں باہمی حاجات کا وقوع اور حاجات کا سہل طور پر حصول واجب کرتے ہیں ایک آداب ہیں جن کو بنی آدم باہم ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں اور ان میں سے اکثر آداب تو ایسے ہیں جن کے اصول پر عرب اور عجم کے مختلف گروہ متفق ہیں۔ اگرچہ کہ ان کی صورتوں اور اشباح کے اندر ان کا اختلاف ہے۔ پس ان آداب سے بحث کرنا اور ان آداب میں سے اچھے کو برے سے تمیز کرنا، ان مصلحتوں میں سے ایک مصلحت ہے جن کو پورا کرنے کے لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔

اس موضوع پر شاہ صاحب نے بڑی مفصل و مدلل بحث کی ہے لیکن یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں ہے۔ پس اس کے بعد یہ بات جان لینی چاہیے کہ مجالس اور محافل میں داخل ہونے والے شخص کے لیے قیام کرنا، جیساکہ اس زمانہ میں مشہور و معلوم اور متعارف ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور بعض فقہاء کے نزدیک سنّت ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔ چناں چہ اس کی وضاحت شیخ عبدالحق دہلوی نے ترجمہ مشکوٰۃ میں کی ہے۔

صاحبِ جامع الرموز نے کتاب الکراھیہ میں لکھا ہے:

کسی شخص کی تعظیم و تکریم اور اس کے ساتھ اظہارِ محبت و الفت کے لیے قیام کرنا مکروہ نہیں ہے۔ البتہ کسی شخص کا اپنے دل میں اس بات کی خواہش اور تمنّا رکھنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے کہ لوگ اس کے لیے قیام کریں۔

صاحبِ حجۃ اللہ البالغہ نے قیام سے

(انتہی)

متعلق یہ صراحت کی ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

تعظیم کے لیے کھڑے ہونے میں احادیث مختلف ہیں۔

نیز شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اور تعظیم کے لیے کھڑا ہونا، ایک مومن کی خوشنودی کے لیے اور اس کی تعظیم و تکریم کے لیے اور اس کے دل کو خوش کرنے کے لیے ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ یہ قیام اس کے سامنے خدمت گاری کے لیے نہ ہو۔ (انتہی)

امام حجۃ الاسلام غزالی سے خالق الناس باخلاقہم کے حکم کے مطابق قیام کی عادت میں قوم کی موافقت کرنے کو سنّت شمار کیا ہے چناں چہ کتاب کیمیائے سعادت کے دوسرے رکن کی آٹھویں اصل میں فرماتے ہیں:

لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا اور ان کے دلوں کو خوش کرنا شریعت میں فعلِ محمود اور پسندیدہ امر ہے۔ اور ہر قوم کی ایک عادت ہوگی جس کی خلاف ورزی اس قوم کے اخلاق میں بدخوئی اور بداخلاقی تصوّر ہوگی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ہر شخص کے ساتھ اس کی عادت و خصلت کے موافق زندگی گزاریں جب کہ یہ قوم اس موافقت اور مطابقت سے خوش ہو رہی ہو اور موافقت نہ کرنے کی وجہ سے حیران اور متوحش ہو رہی ہو تو ایسی صورت میں اس کے موافقت و مطابقت کرنا سنّت کی قبیل سے ہے۔ اور حضرات صحابہؓ، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قیام نہیں کرتے تھے، کیوں کہ یہ بات آپ کو ناپسند تھی۔ لیکن جب قیام عادت کے مقام میں ہو اور اس کا ترک کرنا حیرت و استعجاب اور وحشت کا باعث ہو تو لوگوں کی خوشی اور ان کا دل رکھ لینے کے لیے قیام کرنا بہتر ہوگا۔ کیوں کہ عربوں کی عادت دوسری ہے۔ اور عجمیوں کی عادت دوسری ہے۔ (انتہی)

اس مسئلہ میں حق بات تو یہ ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مجلس میں داخل ہونے والے کی تعظیم و تکریم کے لیے قیام کرنے کی عادت نہ تھی۔ قیام کرنے اور قیام نہ کرنے کا مسئلہ حالات و اشخاص اور زمانوں کے موافق مختلف رہا ہے اور اس فتنہ و فساد کے زمانے میں خصوصاً ہندوستان کے شہروں میں قیام کرنا واجب ہے۔ کیوں کہ قیام نہ کرنا چغل خوری و غیبت اور دشمنی و خصومت کا باعث ہو جاتا ہے اور شریعت کا قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جو حرام کی طرف کھینچ لے جائے وہ بھی حرام ہے۔

خزانۃ الروایۃ کے حوالہ سے ملّا علی قاری نے لکھا ہے کہ جب کسی شہر میں ایک دوسرے

کی تعظیم و تکریم کے لیے کھڑے ہو جانے کی رسم ہو اور اگر کوئی مسلمان قیام نہ کرنے سے رنجیدہ ہوتا ہو تو ایسی صورت میں اس کی دل جمعی اور تالیفِ قلب کی خاطر قیام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ایک مسلمان کو ایذا پہنچانا حرام ہے۔ (انتہی)

اور ابنِ بطال کہتے ہیں کہ جب ایک فعل کسی شخص کو حرام کی جانب مائل کر سکتا ہے تو وہ فعل اس شخص پر حرام ہو جاتا ہے۔ پہلے سے وہ شخص حرام کا قصد کرنے والا نہ ہو۔ (انتہی)

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی مناسبت سے فقہا نے یہ حکم دیا کہ شب میں بلند آواز کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا اور ذکرِ الٰہی کرنا اگرچہ کہ سنّت ہے لیکن جب ایک ہمسایہ کی نیند میں خلل ہو رہا ہو اور اس کو تکلیف پہنچ رہی ہو تو باآوازِ بلند تلاوت اور ذکر سے باز آ جائے۔ ورنہ حاکم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی طاقت کے ذریعہ اس کو منع کر دے۔

اسی طرح مصلی کو سجدہ میں اپنے دونوں بازو کو پہلو سے دور رکھنا اگرچہ کہ سنّت ہے لیکن جماعت کی نماز میں اپنے بازوؤں کو پہلو سے دور نہ رکھے تاکہ اس کے قریب والے مصلیوں کو ایذا و تکلیف نہ ہو۔

"حمیدی" میں کہا گیا ہے کہ یہ علّت اس حقیقت کی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ ایک مسلمان کو تکلیف دینے سے احتراز کرنا چاہیے۔ حالاں کہ اس کی ایذا میں اقامتِ سنّت کا پہلو موجود ہے۔ بلکہ فقہا نے حاکم کی موجودگی کو نمازِ جمعہ و عیدین کی ادائیگی کے لیے ایک شرط قرار دی ہے۔ چناں چہ یہ شرط اس بات کی خبر دے رہی ہے کہ فتنہ و فساد کے اندیشہ کی صورت میں سنّت تو کجا فرض اور واجب کی ادائیگی بھی جائز نہیں رہتی۔ اسی لیے علامہ ابن صلاح اور علامہ ابنِ عبد السلام نے اپنے دور میں فتنہ و فساد کھڑے ہونے کے اندیشہ سے یہ فتویٰ دیا تھا کہ مجالس میں داخل ہونے والے شخص کے لیے قیام کرنا واجب ہے بلکہ بعض فقہا نے تو مال داروں کے لیے قیام کرنے کو مکروہ قرار نہیں دیا۔ اور بعض فقہا نے تو مسجد میں اور تلاوتِ قرآن مجید کے دوران بھی دوسرے کی تعظیم و تکریم کے لیے کھڑے ہو جانے کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ صاحبِ جامع الرموز نے کتاب الکراھیہ میں تحریر کیا ہے۔

ابوالقاسم الحکیم کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ مال داروں کے لیے قیام کرتے تھے اور فقرا و مساکین کے لیے قیام نہیں کرتے تھے۔

اور نہایہ میں مرقوم ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیر کی تعظیم کے لیے قیام کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اور زاہدی میں مسطور ہے کہ مسجد میں کسی شخص کی تعظیم و تکریم کے لیے قیام کیا جائے

تو یہ کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ بات نہیں ہے اور اسی طرح تلاوت کرنے والا شخص کسی کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جائے تو یہ کوئی کراہت والی بات نہیں ہے۔ (انتہیٰ)

بعض علما نے مصحفِ شریف کی تعظیم کے لیے قیام کو مستحب کہا ہے جیسا کہ علامہ بدخشانی نے معارف العلوم میں اور علامہ سیوطی نے الاتقان، بحثِ رسم الخط میں لکھا ہے:

"قواعد میں شیخ عزالدین عبدالسلام نے فرمایا کہ مصحفِ شریف کے لیے قیام کرنا بدعت ہے۔ پہلی صدی ہجری میں یہ فعل ناپسند تھا۔

اس مسئلہ میں صحیح موقف تو وہی ہے جس کو امام نووی نے اختیار کیا ہے۔ چناں چہ انہوں نے "تبیان" میں لکھا ہے کہ یہ فعل مستحب ہے کیوں کہ اس کے اندر تعظیم و تکریم اور عدمِ تحقیر کا پہلو موجود ہے۔ (انتہیٰ) بعض علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ کے بیان میں اور اسمِ مبارک کے ذکر کے وقت میں تعظیم و تکریم نبویؐ کے لیے کھڑے ہو جانے کو مستحسن قرار دیا ہے۔ چناں چہ اس کی تفصیل ہم بارھویں فائدے میں پیش کر چکے ہیں۔

سلام، مصافحہ اور معانقہ کا حکم

واضح ہو کہ سلام، مصافحہ اور معانقہ بھی آدابِ صحبت میں سے ہیں۔ مولانا شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں آدابِ صحبت سے متعلق جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

منجملہ آدابِ صحبت میں سے ایک سلام کرنا بھی ہے۔ جس کو بعض، بعض کے لیے عمل میں لایا کرتے ہیں، کیوں کہ لوگوں کو اس بات کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خوشی و مسرت کا اظہار کریں اور باہم لطف و مہربانی اور مہر و وفا سے پیش آئیں۔ اور چھوٹے بڑوں کو بزرگ خیال کریں۔ اور بڑے چھوٹوں پر شفقت کریں، اور اہلِ زمانہ آپس میں بھائی بھائی اور دوست بن کر رہیں کیوں کہ اگر یہ باتیں نہ ہوں تو باہمی صحبت اور ہم نشینی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور نہ ہی صحبت سے کوئی نتیجہ حاصل ہوگا۔

اظہارِ مسرت کے لیے کسی ایک لفظ کا تقرر ایک ناگزیر صورتِ حال ہے کیوں کہ خوشی اور مسرت ایک اندرونی چیز ہے جو قرائن سے استنباط کئے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہر قوم کے سلف کا طریقہ ان کی رائے کے مطابق آپس میں سلام کے برتاؤ کا چلا آیا ہے پھر وہ اُن کے مذہب کا شعار ہوگیا۔ اور اس بات کی علامت اور اس امر کا نشان ہوگیا کہ فلاں شخص فلاں قوم سے ہے۔ چناں چہ مشرکین انعم اللہ بك علینا اور انعم اللہ بك صباحا کہا کرتے تھے۔ اور مجوسی ہزار سال بزی کہا کرتے تھے۔ اور شریعتِ مصطفویؐ کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس امر میں وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو انبیاءِ کرام کی سنّت سے ہو۔ اور جس کو انبیاء نے ملائکہ سے سیکھا ہے اور وہ طریقہ دعا اور ذکرِ الٰہی کے قبیل سے ہو۔ نہ کہ صرف دنیاوی زندگی پر مطمئن ہونے کی قبیل سے ہو۔ مثلاً درازیٔ عمر، زیادتیٔ دولت کی آرزو اور نہ اس طریقہ میں حد سے زیادہ تعظیم ہو کہ آدمی

سلام، مصافحہ اور معانقہ کا حکم

واضح ہو کہ سلام، مصافحہ اور معانقہ بھی آداب صحبت میں سے ہیں۔ مولانا شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں آداب صحبت سے متعلق جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

منجملہ آدابِ صحبت میں سے ایک سلام کرنا بھی ہے۔ جس کو بعض، بعض کے لیے عمل میں لایا کرتے ہیں، کیوں کہ لوگوں کو اس بات کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خوشی و مسرت کا اظہار کریں اور باہم لطف و مہربانی اور مہر و وفا سے پیش آئیں۔ اور چھوٹے بڑوں کو بزرگ خیال کریں۔ اور بڑے چھوٹوں پر شفقت کریں، اور اہل زمانہ آپس میں بھائی بھائی اور دوست بن کر رہیں کیوں کہ اگر یہ باتیں نہ ہوں تو باہمی صحبت اور ہم نشینی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور نہ ہی صحبت سے کوئی نتیجہ حاصل ہوگا۔

اظہارِ مسرت کے لیے کسی ایک لفظ کا تقرر ایک ناگزیر صورتِ حال ہے کیوں کہ خوشی اور مسرت ایک اندرونی چیز ہے جو قرائن سے استنباط کئے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہر قوم کے سلف کا طریقہ ان کی رائے کے مطابق آپس میں سلام کے برتاؤ کا چلا آیا ہے۔ پھر وہ اُن کے مذہب کا شعار ہو گیا۔ اور اس بات کی علامت اور اس امر کا نشان ہو گیا کہ فلاں شخص فلاں قوم سے ہے۔ چناں چہ مشرکین انعم اللہ بك علینا اور انعم اللہ بك صباحا کہا کرتے تھے۔ اور مجوسی ہزار سال بزی کہا کرتے تھے۔ اور شریعتِ مصطفویؐ کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس امر میں وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو انبیاء کرام کی سنّت سے ہو۔ اور جس کو انبیاء نے ملائکہ سے سیکھا ہے اور وہ طریقہ دعا اور ذکر الٰہی کے قبیل سے ہو۔ نہ کہ صرف دنیاوی زندگی پر مطمئن ہونے کی قبیل سے ہو۔ مثلاً درازیٔ عمر، زیادتیٔ دولت کی آرزو اور نہ اس طریقہ میں حد سے زیادہ تعظیم ہو کہ آدمی

کو شرک کے قریب کردے۔ جیسے سجدہ کرنا، زمین بوسی وغیرہ اور وہ طریقہ سلام ہے (جس میں دعا، ذکرِ الٰہی، اعتدال پہ مبنی تعظیم اور دنیاوی نعمتوں کی سلامتی وغیرہ شامل ہے۔)

نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تم لوگ جنّت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ ایمان نہ لے آؤ، اور جب تک آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ الفت نہ کروگے تو مومن نہ ہونگے۔ کیا میں تم کو ایک ایسی چیز کی نشان دہی نہ کروں جس کو اپنانے سے تمہارے دلوں میں محبت و الفت پیدا ہو جائے؟ پس تم آپس میں ایک دوسرے کو سلام کیا کرو۔!

میں یہ کہتا ہوں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا فائدہ اور اس کی مشروعیت کا سبب بیان فرمایا۔ کیوں کہ لوگوں کا آپس میں محبت کرنا یہ ایک ایسی خصلت ہے جو اللہ کو پسند ہے اور باہمی محبت و الفت پیدا کرنے کے لیے سلام ایک عمدہ اور مفید ذریعہ ہے۔ اسی طرح مصافحہ اور دست بوسی وغیرہ بھی باہمی محبت و الفت پیدا ہونے کے لیے ایک مفید ذریعہ ہے۔

نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چھوٹے بڑوں کو، چلنے والے بیٹھے ہوئے لوگوں کو، تھوڑے افراد بہت سے لوگوں کو اور سواری پہ چلنے والے پیادہ چلنے والوں کو سلام کریں۔

میں کہتا ہوں، لوگوں میں یہ دستور عام تھا کہ باہر سے آنے والا شخص گھر والوں کو سلام کیا کرتا تھا۔ اور ادنیٰ درجہ کا آدمی، اعلیٰ درجہ کے آدمی کو سلام کیا کرتا تھا۔ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو بدستور باقی رکھا البتہ اس میں تغیر یہ فرمایا کہ آپؐ عورتوں اور بچّوں کے پاس سے گزرتے تو ان کو بھی سلام کیا کرتے تھے۔ یہ سمجھ کر کہ انسان کا اس شخص کو بزرگ سمجھنا جو اس سے بڑا اور اشراف ہے اپنے اندر فضائل شئ کو جمع کر لینے کے اعتبار سے بےشک اس میں ایک طرح کی خود پسندی ہے۔ اس لیے نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دستور مقرر کیا کہ اعلیٰ درجے کے لوگ تواضع و انکساری اختیار کریں اور کم درجہ کے لوگ، اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی تعظیم و تکریم کریں چناں چہ آپؐ نے صاف لفظوں میں فرمایا:

جو شخص چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اور سوار کو پیادہ چلنے والے کے لیے سلام کا طریقہ اس لیے مقرر فرمایا کہ لوگوں کے نزدیک سوار باہیبت اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے باعظمت ہوتا ہے۔ اسی لیے آپؐ نے سوار کے لیے تواضع اور انکسار کا حکم دیا۔ اور شاہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

اور مصافحہ کرنے میں اور خوش آمدید

مرحبا اھلاً و سھلاً کہتے ہیں اور باہر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ کرتے ہیں یہ راز ہے کہ ان امور سے محبت والفت اور خوشی و مسرت بڑھتی ہے اور وحشت و اجنبیت اور نفرت و عداوت دُور ہوتی ہے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان باہم ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں اور اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کردیتا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان محبت و الفت اور لطف و مہربانی کا پایا جانا اور ان کے درمیان اللہ کا ذکر جاری ہونا یہ ایسی خصلت ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اور اس سے خدا خوش ہوتا ہے۔ (انتہیٰ)

سلام سے متعلق صاحب ترجمۂ مشکوٰۃ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ سلام، اسلام کے عظیم ترین شعائر میں سے ایک شعار ہے۔ جو اسلام کے ابتدائی دَور میں کافر اور مسلمان کے درمیان فرق و امتیاز کی علامت تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا سلام زبان سے کچھ کہے بغیر صرف ہاتھ سے اشارہ کرنا ہے۔ مگر یہود کا اشارہ انگلیوں سے ہے اور عیسائیوں کا اشارہ ہتھیلی سے ہے۔ اور اسلام کا سلام زبان سے سے السلام علیکم کہنا ہے اور سلام کرنا سنت ہے۔ اور اس کا جواب دینا فرض ہے۔ اکثر اہلِ علم کی رائے کے مطابق سلام کا معنیٰ اور مفہوم یہ ہے کہ آپ کو میرے طرف سے سلامتی اور امن ہے۔ اور آپ بھی مجھے اپنی طرف سے امن اور سلامتی دیں۔ (انتہیٰ)

زبان سے سلام کرتے وقت یا سلام کا جواب دیتے وقت ہاتھ سر پہ رکھنے کے جواز میں مولانا محمد مخدوم ہاشمی سندھی نے ایک سوال کے جواب میں جو لکھا ہے وہ من وعن یہاں نقل کیا جارہا ہے:

سوال: سلام کے وقت زبان سے السلام علیکم، کہے بغیر صرف ہاتھ سر پہ رکھ لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سلام کرنے کے وقت میں اور جواب دینے کے وقت میں زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ کا سر پہ رکھنا جائز ہے۔ سلام اور سلام کے جواب میں زبان سے کہے بغیر صرف ہاتھ کا سر پہ رکھنا بدعتِ قبیحہ ہے اور صرف ہاتھ وغیرہ سے اشارہ کردینا کافی نہیں ہے۔ ابنِ شیبہ نے عطا سے روایت کی ہے کہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سلام کرنا مکروہ ہے۔ اور سر کے اشارے سے سلام کرنا مکروہ نہیں ہے۔ "شرح المھذب" میں مرقوم ہے کہ

زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے اشارہ کے ساتھ سلام کیا جائے تو بہت خوب ہے اور یہ سنّت ہے۔ چناں چہ اسماء بنتِ یزید فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد کے پاس سے تشریف لے گئے جہاں عورتوں کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔ آپؐ نے السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔

امامِ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ یہ حدیثِ پاک اس حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام میں لفظ اور اشارہ دونوں کو جمع فرمایا۔

اور ابو داؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے جو لفظ اور اشارہ کے جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے، مگر ابو داؤد نے اپنی روایت میں "فسلّم" روایت کیا ہے۔ یعنی ترمذی نے اپنی روایت میں "فالوی بیدہ" کہا ہے اور ابوداؤد نے اس کے مقام پر فسلّم۔ ویسے ہی مذکو حدیث کی روایت ابن ماجہ اور الدارمی نے بھی کی ہے جیسا کہ مشکواۃ میں ہے۔

پس حدیثِ مذکور کی اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ اس میں زبان سے لفظ سلام اور ہاتھ سے اشارہ دونوں کو جمع کیا گیا ہے اور حدیث میں الگ الگ دونوں طریقوں سے بھی روایت ہے تو پھر ابو داؤد میں ایک امر یعنی زبان سے سلام کا ذکر نا اور ہاتھ سے اشارہ کا ذکر ترک کرنا یا تو بھول کی وجہ سے ہو سکتا ہے یا اسی قسم کی اور کسی وجہ سے الی آخرہ (اذکار النووی للشیخ ابن علان البکری الشافعی بذاتِ خود)

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ سلام کرتے وقت یا سلام کا جواب دیتے وقت زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کو سر پر رکھیں تو جائز ہے اور اس کے برعکس یعنی صرف اشارہ سے سلام کرنا یا جواب دینا دونوں ناجائز ہے۔

سلام کرتے وقت جھک جانا مکروہ ہے۔ عالمگیری میں مرقوم ہے کہ بادشاہ وغیرہ کو سلام کرتے وقت جھکنا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ طریقہ مجوسیوں کے فعل سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ 'جواہر الاخلاطی' میں مرقوم ہے۔

سلام کرتے وقت جھک جانا مکروہ ہے اور اس کے متعلق ممانعت آئی ہوئی ہے۔ جیسا کہ تمرتاشی میں مرقوم ہے۔ (انتہی)

حاصلِ کلام!

سلام کرتے وقت جھک جانا خواہ گردن سے ہو یا پشت سے ہو، مکروہ ہے۔ اور نہ جھکنا اگرچہ کہ سنّت ہے لیکن چوں کہ دیارِ ہند میں نہ جھکنا مسلمانوں کے لیے ایذا اور تکلیف کا باعث ہو جاتا ہے اور غیبت، چغل خوری بلکہ دشمنی

اور نزاع تک پہنچنے کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہاں لوگوں کو سلام کے وقت جھکنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ لہذا حدیث نبوی خالق الناس باخلاقھم (ہر شخص کے ساتھ اس کی عادت وخصلت کے موافق زندگی گذارو) کی رعایت کرتے ہوئے ہمسر اشخاص کو گردن جھکا کر سلام کرتے ہیں۔ اور بزرگوں کو پشت کے ساتھ جھک کر سلام کرتے ہیں۔

یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ سلام کرتے وقت نہ جھکنا سنت ہے اور ایک مسلمان کو تکلیف دینا حرام ہے۔ اور ایک سنّت کو قائم کرنا، حرام کے وقوع کا سبب بن رہا ہے۔ لہذا ہر وہ چیز جو حرام کی جانب لے جائے وہ بھی حرام ہے اور یہ شریعت کے قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل قیام کے حکم میں گزر چکی ہے۔

قدم بوسی کا حکم

نیز جاننا چاہیے کہ قدم بوسی سنت ہے
صاحبِ درالمختار فرماتے ہیں کہ کسی نے کسی عالم یا زاہد سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنا قدم اس کی طرف بڑھائیں اور قدم بوسی کا موقع دیں تو درخواست قبول کر لینا چاہیے۔ اور ایک قول ہے کہ اس کی اجازت نہ دے۔ انتہی

ردّالمختار، حاشیہ درالمختار میں مرقوم ہے کہ عالم اس کی درخواست کو قبول کرے گا اس حدیث کے پیشِ نظر، جس کو حاکم نے اخراج کیا ہے۔ کہ ایک آدمی بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز بتلائیے جس سے ایمان وایقان میں زیادتی ہو سکے۔ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس درخت کے پاس جاؤ اور اس کو بلاؤ۔ پس وہ شخص درخت کے پاس گیا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا، اللہ کے رسول تجھے بلا رہے ہیں۔ پس وہ درخت چلا آیا۔ اور نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپؐ نے درخت سے فرمایا: اچھا لوٹ جاؤ۔ بس وہ لوٹ گیا۔ اس آدمی نے کہا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دے دی تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک اور دونوں پیروں کو چوم لیا۔
اس پر نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں کسی شخص کو کسی کے لیے سجدہ کا حکم دیتا تو ضرور عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔
حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے (از رسالہ شرنبلالی انتہی)

صاحب المنیہ در مختار کی عبارت:
اجابہ کے تحت کہا ہے کہ بے شک صحابہ رضی اللہ عنہم نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دست بوسی اور قدم بوسی کیا کرتے تھے جیسا کہ الاختیار میں مذکور ہے۔ انتہی

شیخ الھند شرح سفر السعادۃ میں لکھتے ہیں کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے افراد جب مدینۂ منورہ پہنچتے تو اپنے سواریوں سے اتر پڑتے اور نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔
امام ابوداؤد نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ انتہی۔

شیخ الہند ترجمہ مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں

صاحب صحیح المسلم امام مسلم جب صاحب صحیح البخاری امام بخاریؒ کی یہاں حاضر ہوتے تو عرض کرتے تھے کہ مجھے آپ کے قدم بوسی کا موقع عنایت فرمائیے۔ انتہی

شرف الملّت والدّین یحییٰ منیری ۱۸۱ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں کہ مرید کی نظر میں ہمیشہ اپنے مرشد کے کمال اور خوبی پر اور اپنے نقص اور عیب کی جانب رہنا چاہیے۔ اور اگر مرشد کے کسی ایسے فعل کا صدور دیکھے جو اس کی عقل اور حوصلہ میں نہ سما سکے تو یہ اعتقاد رکھے کہ مرشد کا فعل اپنی جگہ صحیح اور درست ہے البتہ میری عقل اس فعل کی حقیقت کو نہیں سمجھ رہی ہے۔ اور یہ کہ مریدین جو مرشدوں کی دست بوسی و قدم بوسی کرتے ہیں درست ہے۔ اور منقول ہے کہ مرشد کی قدم بوسی صحابہ کرامؓ کی سنّت ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کو بہت بوسہ دیتے ہیں۔

روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوی۔ اور نو آیات بینات کے متعلق دریافت کی تو آپؐ نے انھیں تفصیل بتلائی۔ پس اس جماعت نے آپؐ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا اور آپؐ کی باتوں کی تصدیق کی۔ اور نبیٔ کریم صلعم نے انھیں دست بوسی اور قدم بوسی سے منع نہیں کیا۔

اگر یہ فعل خلاف شرع ہوتا تو آپؐ ضرور ان کو منع فرماتے۔

اسی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دست بوسی اور قدم بوسی فعل مشروع ہے۔

ذراع بن عامر فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومے ہیں۔

خادم عباسؓ حضرت صہیبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو حضرت عباسؓ کے ہاتھ اور پیر چومتے ہوئے دیکھا ہے۔ انتہی

کوتاہ نظر اشخاص قدم بوسی کے مسئلہ میں بزرگوں کو طعنہ دیتے ہیں۔ ان کی یہ طعنہ زنی ان کے علم کی کمی اور ان کے گستاخ و بے باک ہونے کی نشان دہی کر رہی ہے۔

زمین چومنے اور زمین پر رخسار یا جبین رکھنے اور سجدہ کرنے کا حکم

نیز جاننا چاہیے کہ زمین بوسی اور رخسار یا جبین زمین پر رکھنے اور سجدہ کرنے کے احکام مختلف ہیں۔ شیخ المحقق ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

علماء، مشائخ اور امراء کے آگے زمین بوسی حرام ہے اور اس کا کرنے والا اور اس پر راضی رہنے والا ہر دونوں گناہ گار اور گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے۔ اور اگر اس فعل میں عبادت کا تصوّر شامل رہا تو کافر ہو جائے گا۔ اور اسی طرح اگر اصلاً کوئی بھی نیت مستحضر نہ تو بھی کافر ہوگا۔ اکثر علماء کے نزدیک پیشانی یا رخسار زمین پر رکھنے سے کہیں زیادہ ہلکا اور سبک تر زمین بوسی ہے۔ جیسا کہ ظہیریہ میں مرقوم ہے انتہی

صاحب الاشباہ والنظائر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بادشاہ کو سجدہ کرے اور اس کی نیت عبادت کی نہ ہوگی بلکہ سلام و تحیت اور تعظیم و تکریم مقصود ہو تو وہ کافر نہیں ہوگا۔ اس کی اصل آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ان کے بھائیوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہے۔

اور اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کے لیے سجدہ نہ کرنے پر قتل کی دھمکی کے ذریعہ مجبور کیا گیا ہو تو ایسی صورت میں سجدہ کا حکم اگر عبادت کے طریقہ پر ہو تو افضل یہی ہے کہ وہ آدمی صبر کرے جیسا کہ کسی شخص کو کفر پر مجبور کیا جائے۔ اور اگر وہ سجدہ کا حکم سلام و تحیت اور تعظیم و تکریم کے طریقہ پر ہو تو سجدہ افضل ہے۔

صاحب الاشباہ والنظائر کے قول ان سجد للسلطان الخ کے تحت علامہ حموی رح لکھتے ہیں کہ عینی نے مختصر الفتاویٰ الظہیریہ میں لکھا ہے کہ ابو منصور ماتریدی سے فرمایا:

جب کوئی شخص بادشاہ کے آگے زمین کو بوسہ دے یا اس کے لیے اپنی پشت جھکائے یا اس کے لیے اپنے سر کو جھکائے تو وہ کافر نہیں ہوگا کیوں کہ وہ ان افعال میں بادشاہ کی تعظیم و تکریم کا ارادہ کیا ہے نہ کہ اس کی عبادت کا

ابو منصور ماتریدی کے علاوہ دیگر مشائخ نے فرمایا۔ جب کوئی شخص ان ظالم اور جابر لوگوں کو تعظیم کی نیت سے سجدہ کرے تو اس کو

گناہ کبیرہ کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ سجدہ کرنے والا کافر ہو جائے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مطلق کافر ہو جائے گا۔ خواہ تعظیم کے لیے سجدہ کرے یا عبادۃ کی غرض سے۔

اور اکثر مشائخ کی رائے ہے کہ یہ حکم اسباب و وجوہ پر مبنی رہے گا۔ اگر وہ شخص سجدہ کے ذریعہ عبادۃ کا ارادہ کیا ہے تو کافر ہو گا۔ اور اگر سلام و تحیت اور تعظیم و تکریم کا ارادہ کیا ہے تو کافر نہ ہو گا۔ مگر یہ فعل اس کے حق میں حرام ہو گا اگر اس نے کوئی بھی ارادہ نہیں کیا تھا تو اکثر علماء کے پاس کافر ہو گا۔

لیکن زمین بوسی سجدے سے قریب ہے مگر یہ فعل زمین پر رخسار و جبین رکھنے سے ہلکا اور سبک تر ہے۔ انتہی

بعض علماء نے اولیائے کرام کی درگاہوں کی چوکھٹ چومنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس مقدمہ کی تفصیل ۳۸ ویں فائدہ کے آخر میں آرہی ہے

شیخ الھند مدارج النبوۃ کی جلد اول اور شرح سفر السعادۃ میں لکھتے ہیں کہ

سجدہ کی ایک دوسری قسم بھی ہے، جس کو سجدۂ تحیت کہتے ہیں۔ اور بعض فقہی روایات میں اس کی اجازت آئی ہوئی ہے اور مختار قول یہ ہے کہ سجدۂ تحیت بھی حرام اور مکروہِ تحریمی ہے۔ انتہی

لیکن یہ روایت فقہیہ چوں کہ اجماعِ قطعی کے مخالف ہے اعتبار کے قابل نہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کو ایسی باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اس موضوع کے حق کی ادائیگی تو نویں فائدہ میں ہے۔ وہاں ملاحظہ کیجیے۔

خالق کے ساتھ صحبت کا حکم

نیز جاننا چاہیے کہ خالق اور مخلوق کے ساتھ صحبت کے آداب بہت ہیں۔ امام غزالی 'زاد الآخرت' میں خالق کے ساتھ صحبت کے آداب کی بحث میں فرماتے ہیں:

دوستوں کے ساتھ صحبت اور ہم نشینی کے آداب سیکھنا ضروری ہے جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن وہ دوست جو ہمیشہ تیرے ساتھ سفر و حضر، خواب و بیداری اور موت و حیات میں ہے اور تیرا پیدا کرنے والا ہے اور تیرا مالک ہے اور جب کبھی تو اس کو یاد کرے تو وہ تیرے ہی ساتھ ہے۔ (اس کی صحبت کے آداب کا جاننا انتہائی ضروری اور لازمی ہے۔)

چناں چہ حدیثِ قدسی میں ہے:

میں اس کا جلیس اور مصاحب ہوں جس نے مجھے یاد کیا۔ اور جب کبھی تیرا دل تیری تقصیر کے باعث اس کے حق میں شکستہ ہو جائے تو وہ تیرے ہی نزدیک اور پاس ہی ہے کیوں کہ اسی کا ارشاد ہے، میں شکستہ دلوں میں بسا ہوا ہوں۔

جب تو اس کو پہچان لے گا جیسا کہ پہچان کا حق ہے تو تو اس کے علاوہ کسی اور کو اپنے ہمراہ نہیں رکھے گا۔ اور کبھی کو اپنا دوست بنائے گا۔

اگر تو اس کے ساتھ تمام اوقات میں نہیں رہ سکتا ہے تو کم از کم یہ کوشش کر کہ شب و روز میں ایک ساعت اور ایک لحظہ اس کے ساتھ خلوت میں رہ اور اس کے ساتھ سرگوشی اور مناجات کر۔

اور تیرے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت میں رہنے کے آداب سیکھ لے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت کے آداب یہ ہیں:

اچھی طرح بیٹھ جیسا کہ تو تشہد میں بیٹھتا ہے اور اپنی نگاہوں کو سامنے مرکوز رکھ اور زبان کو خاموش رکھ اور دل کو حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر رکھ اس طرح کہ تیرے دل میں اللہ کے سوا کسی چیز کا گزر اور بسر نہ ہو۔ اور اعضاء کو ساکت رکھ۔

اور تمام اوقات میں ملازم فرمان رہ۔

اور جو بات کبھی پیش آئے دل میں اس کی تقدیر پر اعتراض نہ کر۔ اور اس کی قضا و قدر سے راضی اور خوش رہ اور اللہ کے فضل و کرم پر تکیہ کر۔ اور اسی ذات پر اعتماد کر اور اس بات کو اچھی طرح

ذہن نشین کرلے کہ تیرے حق میں تقدیرِ الٰہی کا جو بھی فیصلہ ہوگا اس میں تیرے لیے خیر و بھلائی ہوگی۔ اور ہمیشہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں پر نادم اور شرمسار رہ اور اللہ کے جلال کی عظمت اور ہیبت سے شکستہ اور گرفتہ دل رہ۔
اور ضروری ہے کہ یہ تمام احوال اور کوائف ہمیشہ تیرے ساتھ ظاہر اور باطن میں پیوستہ رہیں۔ کیوں کہ یہ ایسی ذات کی صحبت کے آداب ہیں جو ہمیشہ تیرے ساتھ ہے اور تجھ سے کبھی جدا نہ ہوگی۔ اور دوسرے جو بھی ہیں وہ سب تجھ سے جدا ہو جائیں گے
انتہی

سید الانبیاء کے خصائص اور آداب

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم، جو تمام پیغمبروں کے سردار اور تمام مرشدوں کے مرشد ہیں، کے حقوق بہت ہیں۔ صاحبِ مواھب لدنیہ، قسم ثالث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص فضائل اور کرامات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

نبی کریم کے مخصوص فضائل و آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کی حدیثیں پڑھنے کے لیے غسل کرنا اور خوش بو لگانا مستحب ہے۔ احادیث کے پڑھنے اور سننے کے دوران آوازوں کو بلند نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اپنی آوازوں کو پست رکھنا چاہیے۔ جس طرح آپ کی حیاتِ ظاہری میں جب آپ کلام فرماتے تو سبھی خاموش رہا کرتے تھے۔

پس بے شک آپ کا کلام آپ کی رحلت کے بعد رفعت و منزلت کے معاملہ میں آپ کی زبان مبارک سے سنے جانے والے کلام کے مانند ہے۔ اور احادیث کو اچھے اور بلند مقام پر پڑھنا چاہیے۔

مطرف سے روایت ہے کہ لوگ امام مالکؒ کے پاس آتے تو گھر سے باہر باندی نکل کر آتی اور کہتی کہ امام صاحب دریافت فرما رہے ہیں کہ آپ لوگ حدیث نبوی کا علم حاصل کرنے آئے ہیں یا فقہی مسائل پوچھنے کے لیے؟ اگر کہا جاتا کہ مسائل دریافت کے خاطر آئے ہیں تو امام موصوف اسی وقت گھر سے باہر نکل آتے اور فقہ کے مسائل اور احکام بتلادیا کرتے اور اگر یہ کہا جاتا کہ علم حدیث حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں تو امام صاحب غسل خانہ میں داخل ہوتے اور غسل کرتے اور خوشبو لگاتے اور نئے کپڑے پہن لیتے اور عمامہ باندھ لیتے اور طیلسان[1] نامی چادر اوڑھ لیتے اور اس کے بعد باہر تشریف لاتے اور آپ کے لیے ایک مخصوص چوکی پیش کی جاتی، جس پر آپ خشوع و خضوع کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے اور اس چوکی پر درس حدیث کے سوا کسی دوسرے موقع پر نہیں بیٹھتے تھے! اور اس وقت تک عود جلایا جاتا تھا جب تک آپ حدیث نبوی کی قرات اور تشریح سے فارغ نہیں ہوتے۔

---

1. ایک قسم کی چادر ہوتی تھی جو خطبہ پڑھنے والے حضرات اپنے کندھوں پر ڈال لیا کرتے تھے۔

ابن ابی ادریس فرماتے ہیں کہ امام مالک سے اس اہتمام اور انتظام کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تعظیم و تکریم کروں اور ممکنہ طہارت و نظافت کی حالت میں بیان کروں اور منقول ہے کہ ان آداب اور طریقوں کو امام مالک نے حضرت سعید بن مسیب سے سیکھا ہے۔ اور قتادہ، مالک اور ایک جماعت نے طہارت کے بغیر حدیث بیان کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت اعمش بغیر وضو ہوتے تو تیمم کرنے کے بعد ہی حدیث بیان کرتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں۔ بے شک نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت اور تعظیم و توقیر آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے ذکر اور آپؐ کی حدیثِ پاک کے ذکر و بیان اور آپؐ کے اسم مبارک اور آپؐ کی سیرت و شمائل سننے کے وقت بھی اسی طرح ہونی چاہیے جس طرح کہ آپؐ کی حیاتِ ظاہری میں ہوتی رہی۔

اور آپؐ کے خصائص میں یہ بھی ہے کہ حدیث پڑھنے والے شخص کے لیے مکروہ ہے کہ وہ دورانِ قرأت میں کسی شخص کے لیے قیام کرے۔

ابن امیر الحجاج 'مدخل' میں فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی خاطر حدیث کے پڑھنے اور سننے کو منقطع کر دینا یہ ایک ایسا عمل ہے جو نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب و احترام میں کمی و قلّت اور آپؐ کے ساتھ بے توجہی ہے۔ پھر کیسے یہ عمل بدعت ہو سکتا ہے۔ اور تحقیق سلف صالحین حدیث کی تدریس اور سماعت کو منقطع نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اس کام کو چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اگرچہ کہ ان کے بدنوں کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔ اور وہ ہر تکلیف و مشقت کو برداشت کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ محض اپنے نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے احترام و اکرام کے خیال سے تھا۔ تمہارے لیے یہی ایک نظیر کافی ہے کہ امام مالکؒ کو بچھو نے سترہ مرتبہ ڈنک مارا اور آپ نے حرکت تک نہ کی۔ اور آپ یہ ساری تکلیف حدیثِ نبویؐ کی تعظیم و توقیر میں یہ سوچ کر سہتے رہے کہ وہ حدیث پڑھ رہے ہیں ایسے میں ایک معمولی ضرر ہو جو اُن کے جسم کو پہنچا ہے حرکت کریں۔ حالاں کہ وہ بچھو کے ڈنک مارنے سے معذور تھے۔ پھر ایک بدعت کے لیے اٹھنا کیسے ضرورت بھی نہیں ہے۔ خصوصاً ایسا اٹھنا امور عادیہ میں سے بھی نہیں ہے۔ انتھی

شیخ الھند مدارج کے نویں باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابن مہدی فرماتے ہیں کہ میں ایک روز امام مالک کے ساتھ مدینۂ منورہ میں وادی عقیق (جس کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم وادئ مقدس فرمایا کرتے تھے اور اس کا ذکر اشعار میں کثرت سے پایا جاتا ہے) کی جانب سے گزر رہا تھا کہ آپ سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا تو مجھے منع کرتے ہوئے فرمایا: اس سوال سے پہلے تم میری نگاہوں میں بزرگ تھے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے متعلق سوال کرتے ہو! حالاں کہ ہم راہ چل رہے ہیں۔ (یعنی راہ چلتے ہوئے حدیث نبویؐ سے متعلق سوال وجواب نبئ کریمؐ کے ساتھ ادب میں داخل نہیں ہے)

جریر بن عبدالحمید جو شہر کے قاضی تھے انہوں امام مالک کے کھڑے ہونے کی حالت میں حدیثِ نبویؐ سے متعلق استفسار کیا تو آپ نے انھیں قید کرنے کا فتویٰ دے دیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ شہر کے قاضی ہیں۔ فرمایا: قاضی اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ پہلے اس کو ادب سکھلایا جائے۔

ہشام بن عمار نے امام مالک کو کھڑے ہونے کی حالت میں حدیث سے متعلق سوال کیا آپ نے اس کو بیس کوڑے مارے۔ اس کے بعد شفقت سے پیش آئے۔ اور بیس حدیثوں کو بیان کیا۔ اس پر ہشام نے کہا: مجھے یہ بات بھلی معلوم ہوی کہ کاش مجھے اور زیادہ کوڑے مارتے تاکہ آپ اور زیادہ احادیث بیان کرتے۔

عبداللہ بن صالح سے منقول ہے کہ مالک اور لیث ہمیشہ باوضو احادیث لکھا کرتے تھے۔ اور یہ بات بہت ہی مشہور ہے کہ امام بخاری اپنی صحیح لکھنے کے وقت میں ہر حدیث کے لیے غسل فرماتے تھے۔ اور دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔ اور یہی اہتمام کتاب کے تراجم کے لکھنے میں بھی رہتا تھا۔ اور بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری آبِ زم زم سے غسل فرماتے اور مقامِ ابراھیمؑ میں دوگانہ ادا کرنے کے بعد حدیث کو تحریر کیا کرتے تھے۔

واللہ اعلم۔

اہلِ بیت یعنی ساداتِ کرام کے حقوق و آداب

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کے حقوق اور آداب بھی بہت ہیں۔

صاحبِ تنبیہ الضالین فرماتے ہیں کہ خاتم المجتہدین ابنِ حجر مکیؒ نے "حسن التوسل" میں لکھا ہے کہ اہلِ بیت کا ادب و احترام اور ان کا پاس و لحاظ اور رعایت کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے واجب ہے۔ کیوں کہ یہ قرابت نبوی ساداتِ کرام سے رفض و بدعت کے صدور کی وجہ سے منقطع نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے باوجود بھی ان پر سب و شتم اور لعن طعن سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ماں باپ کا نافرمان لڑکا وراثت سے محروم نہیں ہوتا اور نہ ہی نسب سے خارج ہوتا ہے۔ صدیقؓ اور فاروقؓ کے حق میں نیک گمان یہ ہے کہ ان کے قرابت داروں کی جانب سے ان کے حق میں جس کسی عیب جینی کا ظہور ہوا ہے اس کو معاف کر دیا جائے۔

لہٰذا تم پر واجب ہے کہ ساداتِ کرام کے ساتھ حسنِ ظن قائم رکھیں اور شفاعتِ محمدیؐ دراصل اہلِ بیت کے گناہ گار افراد ہی کے لیے ہے اور ان سے گناہوں کی گندگی دور کر دی گئی ہے۔ اور بیتِ نبوتؐ کے افراد نصِ قرآنی انما یرید اللہ الآیہ کی رُو سے پاک و صاف کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اکابر اہلِ علم نے آیتِ تطہیر کا یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ اہلِ بیت کا کوئی فرد دنیا سے نہیں جائے گا، جب تک کہ وہ رجسِ معنوی اور نجسِ باطنی سے پاک و صاف نہ ہو جائے اور یہ طہارت و نظافت بیماری یا دیگر آلائم و مصائب کے ذریعہ ہوگی۔ اگرچہ کہ موت سے کچھ دیر قبل ہی کیوں نہ ہو۔

بعض اکابر اہلِ علم نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ ساداتِ کرام کے کسی فرد پر شرعی حد واجب ہو جائے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ جس طرح کہ غلام اپنے آقا کے پاؤں کی نجاست کو دور کرتا ہے۔

مختصر فتوحاتِ مکیہ کے انتیسویں باب میں جس کا اختصار امام شعرانی نے کیا ہے۔ لکھا ہوا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد جو قیامت تک ہوگی وہ سب اس آیت: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس الآیۃ کے حکم کے مطابق بخشش و معافی میں داخل اور شامل ہے۔ اور اہلِ بیت کے لیے یہ جو بزرگی اور شرف حاصل ہے اس کا حقیقی

ظہور آخرت ہی میں ہوگا۔ کیوں کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد کا حشر مغفرت کے ساتھ ہوگا۔ لیکن دنیا میں ان میں سے کوئی شخص گناہ کر بیٹھے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ جیسے گناہ سے توبہ والا شخص حد شرعی سے بچ نہیں سکتا۔ جب حاکم کو یہ ثبوت مل جائے کہ سادات کرام کے کسی شخص نے گناہ کیا ہے، یا چوری کی، یا شراب پی لیا تو وہ اس پر حد جاری کرے گا اگرچہ کہ اس کی مغفرت ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت ماعز بن مالکؓ صحابیٔ رسولؐ تھے لیکن جب ان سے زنا کا صدور ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجم کیا اور اس کی مذمت جائز نہیں ہے۔

اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان رکھنے والے ایک مسلمان اور مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس قول انما یرید اللہ الایہ کی تصدیق کرنا لازم ہے اور یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اہل بیت کے اشخاص سے جو خطائیں اور لغزشیں صادر ہوتی ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کو زیبا نہیں کہ وہ اہل بیت کی مذمت کریں اور ان کی عزت و آبرو لیں۔ جن کے تعلق سے خود اللہ نے شہادت دی کہ میں ان کو پاک و صاف کیا ہوں۔ اور نجاست سے دور کیا ہوں۔

اہل بیت کے افراد کو یہ مقام کسی نیک عمل کو انجام دینے سے نہیں ملا یا ان سے کچھ نیکی صادر ہونے کے باعث نہیں ملا۔ بلکہ ابتدا ہی سے ان پر اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی ہوی اور یہ خدا کا فضل ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔

مولانا جامی سلسلۃ الذھب میں فرماتے ہیں:

ایک عارف باللہ کے نزدیک انما یرید اللہ لیذھب الایۃ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی مراد رجس اور فساد سے اہل بیت کی تطہیر ہے۔ ذی عقل اور صاحب فہم اشخاص سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ رجس گناہوں میں بدترین گناہ ہے۔ جب رجس ذلت اور عصیان ہے تو عفو اور مغفرت کے بغیر اس سے پاکیزگی نہیں ہوسکتی۔ لہذا سارے اہل بیت مغفور ہیں اور آخرت کی عقوبات سے محفوظ ہیں۔ جب یہ افراد گناہ سے بری ہیں تو ان کی مذمت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اور ان کو گناہوں سے معصوم بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور کسی گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے ان کی مذمت بھی نہیں کرنی چاہیے۔

اسی طرح کی تفصیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر میں بھی ہے۔ وہ بھی دیکھ لیں۔ ابن حجر مکی نے صواعق میں یہ حدیث درج کی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص میری آل کا حق نہ پہنچائے تو اس کا حق نہ پہنچانا تین باتوں میں سے کسی نہ کسی ایک بات

کی وجہ سے ہوگا۔ یا تو وہ منافق ہوگا یا ولدالزنا ہوگا یا اس کی ماں کو حالتِ حیض میں حمل رہا ہوگا۔

اور امام احمد نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ جو شخص اہلِ بیت کے ساتھ بغض و عناد رکھے وہ منافق ہے۔ اور دیلمی نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کا سخت ترین عذاب ہوگا جس نے اہلِ بیت کا حق نہ پہچان کر، یا ان کے ساتھ بغض و عناد رکھ کر یا ان کو ایذا دے کر مجھے تکلیف دی۔

اور ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ جو شخص کسی سید کو حقارت کے خیال سے چھوٹا سید کہے تو وہ کافر ہے۔

نیز تنبیہ الضالین میں فرماتے ہیں کہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب ایک گنہ گار سید کا ایمان اور احترام قرآن و حدیث اور آئمہ کرام کے اقوال سے اس قدر ثابت ہے تو کسی جلیل القدر عالِم با عمل سید کے ایمان اور احترام کا عالَم کیا ہوگا۔

شیخ فرید الدین عطار "تذکرۃ الاولیاء" میں فرماتے ہیں کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ ایک مرتبہ درس کے دوران دس بارہ مرتبہ کھڑے ہوئے اور بیٹھ گئے تو آپ سے قیام کی وجہ دریافت کی گئی فرمایا: ایک سید زادہ گیند کھیل رہا تھا اور ہر بار میرے سامنے آجاتا تو میں اس کی تعظیم اور تکریم کے

کے لیے کھڑا ہوتا رہا۔ اس لیے کہ یہ بات نازیبا ہوگی کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرزند آئے اور اس کی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہو جاؤں۔

امام شعرانی بحر المواردمیں لکھتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ ہم ایک سید زادی سے نکاح کریں۔ جب کہ ہم نے اپنے آپ کو اس سید زادی کے خدام میں شمار کیا۔ اس لیے کہ وہ سید زادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جز اور حصّہ ہے۔

شیخ الہند شاہ عبدالحق دہلوی "اخبار اخیار" میں شیخ امان پانی پتی سے نقل کرتے ہیں کہ کامل محبت اور کمال الفت کی علامت یہ ہے کہ محبت اپنے محبوب سے تجاوز کر کے اس کے متعلقین کے ساتھ بھی قائم ہو جائے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے ساتھ کامل محبت کی علامت یہ ہوگی کہ اس کی محبت میں اس کے محبوب پیغمبرؐ کی متابعت کی جائے اور پیغمبر کے ساتھ محبت کی علامت یہ ہوگی کہ آپؐ کی محبت کے ساتھ آپؐ کے اہل بیت کے ساتھ بھی محبت کی جائے۔

منقول ہے کہ شیخ امان پانی پتی کے درس کے اوقات میں ساداتِ کرام کے بچّے کھیلتے کودتے آپ کے کوچہ میں آپہنچتے تو آپ کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے ہو جاتے اور یہ بچے جب تک وہاں کھیلتے رہتے آپ کو بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

نیز شیخ الصدا خبار اخیار میں لکھتے ہیں کہ قاضی شہاب الدین عمر دولت آبادی نے مناقب سادات کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اہلِ بیت کے ساتھ محبت وعقیدت کا حق ادا کیا ہے۔ ان شاء اللہ یہ چیز ان کے لیے آخرت میں سرمایہ سعادت اور نجات کی پونجی ہوگی۔

انہوں نے اس تصنیف کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ قاضی صاحب کے زمانے میں سید اجمل نامی ایک سید تھے جن کا شمار اکابر وقت میں ہوتا تھا۔ لیکن ان کا جمال نسب علم وفضل کے زیور سے خالی تھا۔ غالبًا قاضی صاحب کو ان کے ساتھ امراء وسلاطین کی بعض مجلسوں میں تقدیم وتاخیر کے معاملہ میں نزاع ہوگئی تھی۔

قاضی صاحب اولاً اس بات کے قائل تھے کہ ایک بے علم جاہل سید کے مقابلہ میں ایک عالم کو فضیلت وبرتری اور فوقیت واولیت کا شرف حاصل ہے پھر اس کے بعد ایک غیر سید عالم اور بے علم سید کے درمیان برابری کے قائل ہو گئے اور اس موضوع پر یہ کتاب تحریر کی۔ جس میں انھوں نے وضاحت کی کہ ہماری عالمیت ایک امر یقینی ہے اور تسلیم شدہ حقیقت ہے اور تمہاری سیادت غیر یقینی اور مشکوک ہے۔ لہذا ہمیں تمہارے اوپر فوقیت وبرتری اور ترجیح ثابت ہے۔

قاضی صاحب کے اس نقطۂ نظر سے اُن کے استاد ناخوش اور ناراض ہو گئے جس کی وجہ سے قاضی صاحب کی طبیعت منحرف ہوگئی اور وہ اپنے اس نقطۂ نظر سے رجوع کر گئے اور سادات کرام کے فضائل ومناقب میں یہ کتاب لکھی اور ان کی نوک قلم سے جو باتیں نکلیں ان سے معذرت پیش کی۔

بعض کہتے ہیں کہ قاضی صاحب نے خواب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ انہیں اس نقطۂ نظر پر زجر وتنبیہ فرمارہے ہیں اور سید اجمل کی خوش نودی حاصل کرنے کی ترغیب وتحریص دلا رہے ہیں۔ قاضی صاحب خواب سے بیدار ہوکر سید اجمل کے پاس پہنچے اور ان سے معافی چاہی اور توبہ کی اور یہ رسالہ تصنیف کیا — انتہی

جب نفسِ سیادت اور سادات کرام کی عوام کا یہ مقام ہے تو سادات کے اہل علم وکمال کا مقام کیا ہوگا؟ جو ساری دنیا کے امام اور مقتدا ہیں۔ اور جمہور سلاسل ان ہی حضرات کی جانب لوٹتے ہیں۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی

"ہمعات" میں نسبت اولیسیہ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ ہر سِرّ الٰہی جو اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے، لامحالہ اسی عالم سے اس کی ایک خاص جسم وصورت ہوتی ہے۔ جو سِرّ الٰہی کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ اور اس اعتبار سے عالم غیب کی توجہ

اس شخص میں متشکل اور متشبح ہوتی ہے اور انسان کے اس مثالی قدوقامت کی عظمت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت میں پہلا شخص جس نے انجذاب کا دروازہ کھولا اور اس منزل میں قدم رکھا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ ہیں اور اسی لیے طریقت کے تمام سلسلے آپؓ کی جانب راجع ہیں۔ اور فی الحقیقت آپؓ کی طرف اولیائے کرام کے سلاسل کا رجوع روایت کی جہت سے ثابت نہیں ہے اور حضرت حسن بصریؒ کو آپؓ کے ساتھ جو خصوصیت ہے وہ دوسروں کے ساتھ نہیں ہے۔ کیوں نہیں معلوم۔

اس کے باوجود حضرت علیؓ کی جانب جمیع سلاسل کے رجوع کرنے پر صوفیاء کے طبقے یکے بعد دیگرے متفق ہیں اور یقیناً صوفیاء کا یہ اتفاق بے وجہ نہیں ہے۔ اور وہ وجہ فقیر کے نزدیک یہ ہے کہ حضرت علیؓ اس امّت کے اندر پہلے مجذوب ہیں۔ اور امّت کے اولیاء اور طرق و سلاسل کے اصحاب میں سب سے زیادہ طاقت ور اور قوی تر شخص حضرت غوث پاکؓ ہیں جنھوں نے موکد وجوہ کے ساتھ راہِ جذب کے اتمام کے بعد اس نسبت کی اصل کی طرف میلان رکھا اور اس راہ میں کامل و مکمل طریقہ سے قدم رکھا ہے۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ حضرت غوث پاکؓ اپنی مزار میں زندوں کی طرح تصرف فرمارہے ہیں اور اس فقیر کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ صوفی جذب کے بعد ہی نسبت اولیسیہ کے کے جوہر حاصل کے رنگ سے رنگین ہوجائے۔

نیز ملّتِ مصطفویہ میں خصوصاً اس دور میں کوئی شخص ان دو (حضرت علیؓ اور حضرتِ غوثِ پاکؓ) بزرگوں سے زیادہ خرقِ عادت کے باب میں مشہور نہیں ہے۔

یہ بات اس حقیقت کی متقاضی ہے کہ عالم غیب کی توجہ اپنی طرف ان دو بزرگوں میں متشکل دیکھے۔

حاصل کلام یہ اسباب اس بات کے متقاضی ہیں کہ آج کے روز اگر کسی شخص کو کسی خاص بزرگ کی روح سے مناسبت پیدا ہوجائے تو وہ ان کی روح سے فیض حاصل کرتا ہے۔ غالباً یہ بات بعید نہیں کہ یہ فیض حضرت امیر المومنین علیؓ اور حضرت غوثؓ جیلانی کی نسبت سے ہو۔ انتہی۔

شیخ الھند ترجمۂ مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ جب کبھی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہٗ اور دیگر صحابۂ کرام سواری کی حالت میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھتے تو نیچے اُتر پڑتے اور جب کبھی حضرات حسنین کو سواری پر دیکھتے تو ان کے رکاب کو بوسہ دیتے تھے۔

مولانا باقر آگاہ مدراسی "ریاض الجنان" میں لکھتے ہیں : ؎

اور ہو کے سوار جب شیخین ! جاتے کوی راہ میں یا کہ ذی النورین
اور عباس و مرتضٰی اے یار ہوتے تھی اوں دونوں سی رہ میں دو چار
جلد اوترتی تھی تینوں کب سی اور چلتی پیادہ سات اونکی

اور ہوتا تھا جب سوار حسنؑ وہ حبیب خدا کا من موہن !
ابن عباس اور دگر اصحاب آ پکڑتی تھی اوس کی دو تو رکاب
اور چلتی تھی اوس کی کچھ ہمراہ بوجتی اوس میں اپنی عزت وجاہ

اور رسالۂ ہشتم (۸) "ہشت بہشت" میں کہا ہے : ؎

اور شافعی وہ امام امت تھی جس سے قوی نبیؐ کی ملت
رکھتا تھا حب آل اطہار یہاں تک کہ خوارج تبہ کار
کرتی تھی برفض اوس کو منسوب بہت اوس سی ہے اس میں نظم مرغوب
کرتا ہوں بشوق دل بیاں میں دو بیت کا ترجمہ یہاں میں
ای آل رسول ذی المناقب الفت ہے تمہاری سب پو واجب
قرآن میں حق کہا ہی یہہ بات پس تمکو یہہ قدر ہو مباہات
کچو نہ پڑھی درود تم پہ ! ہی اوس کی نماز نار وا تر

انتہی ۔

مرشدِ کامل کے حقوق و آداب

نیز واضح ہو کہ مرشدِ کامل کے حقوق و آداب بہت ہیں۔ امام ربّانی رسالہ "مبداء و معاد" میں تحریر فرماتے ہیں:

علم کی شرافت اور علم کا مرتبہ، معلوم کی شرافت اور اس کے مرتبہ کے موافق ہوتا ہے معلوم جس قدر شریف تر ہوتا ہے اس کا علم بھی اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔

پس علمِ باطن جس سے صوفیا ممتاز ہیں اشرف ہوگا۔ علم ظاہر سے جو علمائے ظاہر کا حصّہ ہے جیسا کہ علم ظاہر کی بزرگی و شرافت کپڑا بُننے اور فصد کھولنے والے علم کی شرافت سے بہت اونچی ہے

پس مرشد جس سے علم باطن حاصل کیا جاتا ہے اس کے آداب کی رعایت، استاذ کے آداب کی رعایت کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگی۔ جس سے علم ظاہر سیکھا جاتا ہے اسی طرح علم ظاہر کے استاذ کے آداب کی رعایت فنِ حجامت و حیاکت کے استاذ کے آداب کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔

اور یہی فرق علم ظاہری کے اصناف میں جاری ہے۔ علمِ صرف و نحو کے استاذ سے علم کلام و فقہ کا استاذ اولیٰ ہے۔ اور علم صرف و نحو کا استاذ، علمِ فلسفہ کے استاذ سے اولیٰ ہے۔ کیونکہ علوم فلسفہ علوم معتبرہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے اکثر مسائل لاحاصل اور بے فائدہ ہیں۔ بہت ہی کم مسائل وہ ہیں جو کتب اسلامیہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ اور ان میں بھی تصرفات کئے گئے ہیں اور وہ بھی جہلِ مرکب سے خالی نہیں ہیں کہ عقل اس میدان میں جولانیاں بتا نہیں سکتی۔ ظہور نبوت عقل و نظر کی پہنچ سے ماوراء ہے۔

جاننا چاہیے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے انعامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کے بعد مرشد کے حقوق تمام دوسرے حق داروں کے حقوق پر فوقیت رکھتے ہیں بلکہ دوسروں کے حقوق کو مرشد کے حقوق سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام کے مرشدِ حقیقی ہیں۔

ہر چند کہ جسمانی ولادت والدین سے ہے لیکن معنوی ولادت مرشد کے ساتھ مخصوص ہے جسمانی ولادت کی زندگی چند روزہ ہے۔ ولادتِ

معنوی کی زندگی دائمی اور ابدی ہے۔

اور یہ مرشد ہی ہے جو مرید کی معنوی نجاستوں کو اپنے قلب و روح کے ذریعہ دور کرتا ہے اور اس کے باطن کو پاک وصاف کرتا ہے۔ بعض مریدوں کے حق میں جو توجہات ہوتے ہیں ان میں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نجاستِ باطنی کی تطہیر میں کچھ آلائش صاحبِ توجہ (مرشد) کو لاحق ہوتی ہے جس کا اثر کچھ مدت تک رہتا ہے۔ مرشد ہی ہے جس کے وسیلہ سے (مرید) اللہ عزوجل تک پہنچتا ہے اور یہ (خدا تک پہنچنا) تمام دنیاوی اور اخروی سعادتوں سے بلند تر ہے۔ مرشد ہی ہے جس کے وسیلہ سے نفس امارہ (جو اپنی ذات سے گندہ اور خبیث ہے) پاک اور مطہر ہو جاتا ہے اور وہ (نفس) امارہ کے مقام سے مطمئنہ تک پہنچتا ہے اور کفر طبعی سے نکل کر اسلامِ حقیقی میں آجاتا ہے۔

دگر بگویم شرح ایں بے حد شود (ترجمہ)

اگر میں اس کی شرح کروں تو بے حد و بے انتہا ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ مرشد کی قبولیت میں سعادت ہے اور مرشد کو رد و انکار کرنے میں شقاوت ہے نعوذ باللہ من ذٰلک۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مرشد کی رضا و خوشنودی میں پوشیدہ ہے۔ جب تک مرید اپنے مرشد کی مرضی اور خوشنودی میں اپنے آپ کو گم نہ کرے، اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل نہیں کرتا۔ مرشد کو آزار و تکلیف دینے میں مرید کے لیے آفت ہے۔ اس کے بعد جو ذلت بھی ہو اس کا تدارک ممکن ہے لیکن مرشد کو آزار دیے جانے کا کسی چیز سے تدارک ممکن نہیں۔ مرشد آزاری، مرید کے لیے شقاوت کی جڑ ہے۔ العیاذ باللہ سبحانہ من ذلک

معتقداتِ اسلامیہ میں خلل اور احکام شرعیہ پر عمل میں قصور اس مرشد آزاری کے ثمرات و نتائج ہیں۔ احوال و مواجید کا تعلق تو باطن سے ہے۔ ان کا کیا حال بیان کیا جائے اگر اتفاقاً مرشد آزاری کے باوجود ان احوال کا کوئی اثر باقی رہے تو اس کو استدراج سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ مرشد کو ایذا و تکلیف پہنچانا آخر کار تباہی اور خرابی کا باعث ہوگا اور نقصان و خسران کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

آدابِ عالم

نیز جاننا چاہیے کہ امام غزالیؒ زاد الآخرت میں فرماتے ہیں:

"عالم کے آداب یہ ہیں کہ اگر وہ واقعی اہلِ علم سے ہوگا تو اس کا ادب یہ ہے کہ وہ فراخ حوصلہ، بردبار اور نیک خصلت ہوگا اور اس کی نشست و برخاست باوقار اور عزت و حرمت کے ساتھ ہوگی۔ سر آگے جھکا ہوا ہوگا، مگر بر سبیل تکبر نہیں بلکہ بر سبیل ہیبت و حرمت۔ مخلوق میں سے کسی شخص کے ساتھ تکبر نہیں کرے گا۔ مگر ظالموں کے ساتھ تکبر کے ساتھ پیش آئے گا تاکہ انھیں اور ان کے جور و ستم کو لوگوں کی نگاہ میں حقیر و ذلیل قرار دے۔ مجلسوں میں صدارت کا خواہاں اور جویاں نہیں رہے گا۔ کیوں کہ ایسی خواہش کرنا تکبری ہے۔

مسخرے پن اور کھیل تماشہ کی عادت نہ ڈالے کیوں کہ اس سے لوگوں کے دلوں سے اس کی ہیبت و عظمت ختم ہوجائے گی۔ شاگردوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اور کوئی طالبِ علم اس سے سوال کرے تو جھڑکی نہ دے۔ اگر سوال میں کوئی خلل ہو تو اس کی اصلاح کرے اور اس پر غصّہ کا اظہار نہ کرے اور اگر کوئی چیز خود نہ جانتا ہو تو اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کو ننگ و عار خیال نہ کرے اور اگر کوئی شخص اس کی کسی غلطی پر دلیل و حجّت کے ذریعہ آگاہ کرے تو قبول کرنے کو عید سمجھے اور پھر اپنی بات واپس لے لئے۔ اور شاگرد کو ایسے علم سے منع کرے جو اس کے لیے نقصان و زیان کا باعث ہو۔ اور اس کو نفع بخش اور سود مند علم میں مشغول کرے۔ اور یہ سود مند علم فرضِ عین ہے نہ کہ فرضِ کفایہ اور وہ علم جو فرضِ عین ہے علمِ تقویٰ ہے، جو اس کے ظاہر و باطن کو ناشائستہ صفات سے پاک و صاف کرتا ہے۔ اور احکامِ خداوندی سے اس کو آراستہ کرتا ہے اور اس کو دنیا سے آخرت کی جانب راغب و متوجہ کرتا ہے اور حرص و طمع سے پاک کرتا ہے۔

اور عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر پہلے خود عمل کرے کیوں کہ گفتارِ بے کردار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

آدابِ متعلم

نیز جاننا چاہیے کہ امام غزالیؒ زاد الآخرت میں لکھتے ہیں کہ:

استاذ کے ساتھ شاگرد کے آداب یہ ہیں کہ وہ سلام میں پہل کرے، اور اس کے روبرو بات چیت بہت مختصر کرے اور اپنی طرف سے گفتگو کی ابتدا نہ کرے اور نہ کوئی مسئلہ پوچھے جب تک کہ بات چیت کرنے اور سوال پوچھنے کی اجازت نہ لے۔ اور جب استاذ جواب دے تو اس پر اعتراض نہ کرے۔ اور یوں نہ کہے کہ فلاں شخص اس کے برخلاف یہ کہتا ہے اور نہ کہے کہ اس کے برخلاف یہ بات بہت درست ہے۔ اور اس کے سامنے کسی شخص کے ساتھ چپکے چپکے کوئی راز کی بات نہ کہے اور اس کے سامنے نگاہیں نیچی رکھے اور اگر استاذ کوئی بات کہے تو اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کرے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھے۔ اور ادب و احترام کے ساتھ نماز کی حالت کے مانند بیٹھے۔ جب استاذ ملول ہو تو مسائل کا پڑھنا اور پوچھنا دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھے۔ جب وہ اٹھ کھڑے ہوں تو بات ختم کردے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے اور راہ چلتے چلتے کوئی سوال نہ کرے۔ یہاں تک کہ وہ گھر پہنچ جائے۔ اور اگر اس سے کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھنے میں آئے تو اس کے ساتھ بد اعتقاد نہ ہوں۔ بلکہ یہ خیال کرے کہ وہ ہم سے زیادہ بہتر جانتا ہے اور اس کے نزدیک اس چیز کے متعلق کوئی توجیہ ہوگی جس تک شاگرد کا علم نہ پہنچا ہو۔ اور حضرت موسیٰؑ و خضر علیہما السلام کے واقعہ کو یاد کرلے کہ کس طرح کشتی میں سوراخ ڈالنا حضرت موسیٰؑ کو منکر نظر آیا لیکن حضرت خضرؑ کے علم میں وہ فعل منکر نہ تھا۔

لہٰذا بزرگانِ کرام سے جو بھی اقوال اور افعال سننے اور دیکھنے میں آئیں تو ان سے متعلق ایسا ہی خیال کرے۔ انتہی

محمد خلیل بدخشانی 'معارف العلوم' کی دوسری فصل میں لکھتے ہیں کہ:

شاگرد کو چاہیے کہ وہ استاذ کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھے۔ چار زانو اور دونوں قدم کھڑا کرکے سرین کے بل نہ بیٹھے اور اس سے دو ہاتھ یا اس جیسے فاصلہ پہ بیٹھے۔ اور اتنی دوری ہو کہ وہ استاذ کی آواز کو بخوبی سن سکے۔ کیوں کہ شاگرد کو استاذ کے سامنے بلند آواز کے ساتھ بات چیت کرنا منع ہے۔ اس مسئلہ کو کتاب الاقتصاد کے حوالے سے محیط کی چوتھی فصل میں بیان

کیا گیا ہے۔

نیز اسی کتاب معارف العلوم میں متعلمین کی تعلیم اور استاذ کی تعظیم و توقیر اور اس کی اولاد کی تعظیم و توقیر اور اس کے متعلقین سے متعلق لکھتے ہیں: کہ

ہمارے استاذ شیخ الاسلام برہان الدین مصنفِ 'ہدایہ' حکایت بیان کرتے ہیں کہ بخاری کے جلیل القدر آئمہ کرام میں سے ایک امام مجلسِ درس میں تشریف فرما ہوتے اور وہ کبھی کبھی دورانِ درس میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میرے استاذ کے صاحب زادے گلی میں بچّوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی مسجد کے دروازے تک آجاتے ہیں۔ جب بھی میری نظر ان پر پڑتی ہے تو میں اپنے استاذ کی تعظیم کے خیال سے کھڑا ہو جاتا ہوں۔

نیز اسی کتاب میں رقم طراز ہیں کہ شاگرد اپنے استاذ کی جگہ پر اس کی موجودگی اور غیر موجودگی میں بھی نہ بیٹھے اور اس کے سامنے نہ ہنسے اور نہ اس کے سامنے اپنی آواز کو بلند کرے اور نہ اس سے کسی بات پر جھگڑا کرے بلکہ اس کی باتوں کو تسلیم کرے۔ بات چیت اور چلنے میں اپنے استاذ سے سبقت نہ لے جائے۔ جیسا کہ خلاصہ اور عمدہ میں مرقوم ہے اور جب استاذ شاگرد کو اپنے آگے چلنے کا حکم دے۔ اور اس کے علاوہ وہ امور جو شاگرد کے حق میں ممنوع ہیں ان کو بجا لانے کا حکم دے تو ایسی صورت میں تعمیلِ حکم کے تحت بات کو مان لے کیوں کہ حکم پر عمل کرنا ادب سے کبھی بڑی چیز ہے۔ الامر فوق الادب۔

مولوی باقر آگاہ مدراسی "احسن التبیین" میں لکھتے ہیں:۔

استاذ کے حق کی ادائیگی کی کیفیت اور شکل یہ ہے کہ اس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اس کی تعظیم اور توقیر کا پورا پورا خیال رکھے۔ اگر استاذ کی غیر موجودگی میں کوئی شخص اس کا ذکر بدی سے اور برائی سے کرے تو اپنی طرف سے خفگی اور ناراضگی کا اظہار کرے اور مذمت اور برائی کرنے والے کو اس کی بدگوئی کے مقدار میں زجر و تنبیہ کرے اور مذمت کنندہ کی تنبیہ اور تہدید پر قدرت نہ ہو تو اس مجلس سے نکل جائے۔ اور اگر کوئی شخص استاذ کی بدی اور مذمت کے علاوہ کوئی بات کہے یا کوئی بدعتی استاذ کے کلام پر کوئی تردید لکھے تو شاگرد میں اگر جواب دینے کی قدرت ہو تو اس کی تردید لکھے اور اس بات کو استاذ کے آگے بیان نہ کرے۔ ہاں خیر خواہی کے خیال سے تنہائی میں استاذ کے سامنے اس بات کو بیان کرا دے تو کوئی مضائقہ نہیں اور مخالف و بدعتی کے کلام کو جا بجا مجلسوں میں بیان نہ کرے۔ اور استاذ کی ساری زندگی تک سلامتی اور عافیت کی دُعا کرتا رہے اور اس کی

وفات کے بعد اس کی قبر کی زیارت کو اپنے اوپر لازم کرلے۔ اور جس قدر ممکن اور سہولت ہو اس کے نام سے صدقہ کرے۔ اور اس کی اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرے اور درس سے فراغت کے بعد دست، زانو، یا قدموں کو استاد کی شان و عظمت کے لحاظ سے بوسہ دے۔ اور ان شہروں میں یہ معمول بن گیا کہ وہ تسلیم عرفی بجا لاتے ہیں تحصیلِ علم کا دور ختم ہونے کے بعد استاذ کے پاس اپنی آمد و رفت بند نہ کرے بلکہ جب بھی فرصت ملے اس کی خدمت میں چلا جائے۔

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ استاذ کے روبرو عاجزی اور فروتنی کے ساتھ دو زانو ہو کر بیٹھے جیسا کہ حدیثِ جبرئیل سے اس کی نشان دہی اور آگہی ہوتی ہے اور اس کی جانب تمام ہمت، دل کی توجہ کے ساتھ کان لگا کر اور سر جھکا کر نظریں جھکا کر متوجہ رہے تاکہ اس کے کلام کو اچھی طرح اخذ کر سکے اور ضبطِ ذہن نہ ہونے کی صورت میں دوبارہ وضاحت کے لیے نہ کہے۔

والدین کے ساتھ فرزند کے آداب

نیز جاننا چاہیے کہ ماں اور باپ کے ساتھ فرزند کے آداب بہت ہیں۔ امام غزالیؒ زاد الآخرت میں لکھتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ بیٹے کے آداب یہ ہیں کہ والدین جو بھی کہیں غور سے سنیں اور ان پر نظر پڑتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور اُن کے آگے نہ چلے اور وہ جو بھی حکم دیں اس کو بجالائے اگر اس میں کسی گناہ و معصیت کا پہلو نہ ہو۔ اور اپنی آواز کو اُن کی آواز سے بلند نہ کرے۔ اور جب بھی وہ پکاریں فوراً لبیک کہے اور ان کی رضا و خوشنودی کا متمنی اور حریص رہے۔

اور ہمیشہ خود کو ان کے آگے پست و عاجز بنائے رکھے۔ اور ان لمحات کو کبھی فراموش نہ کرے جب کہ وہ گہوارہ میں مقید تھا تو والدین نے بڑے ناز و نعم کے ساتھ اس کی پرورش کی اور اس کے لیے راتوں کو اپنی میٹھی نیند قربان کردی تھی تو وہ آج کے روز جوانی کے اس درجے پر آپہنچا ہے اُن کے ساتھ سلوک اور رعایت کرنے کو احسان نہ خیال کرے اور ان کی طرف غصّہ و ناراضگی سے نہ دیکھے اور نہ چہرے پر جھریاں ڈالے اور ان کی اجازت کے بغیر سفر نہ کرے۔

بھائیوں اور دوستوں کی صحبت کے آداب

بھائیوں اور دوستوں کی صحبت کے آداب دوسرے ہیں۔ امام غزالیؒ زاد الآخرت میں دوستوں اور بھائیوں کی صحبت و ہم نشینی کے آداب میں تحریر فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے ساتھ برادرانہ اور دوستانہ تعلقات قائم نہ کرو جب تک کہ اس کے اندر دوستی کے شرائط اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت کا جائزہ نہ لے لو۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر شخص اپنے دوست کے دین، (عادات، اطوار، اخلاق اور معاملات وغیرہ) پر ہوتا ہے۔ لہٰذا غور کرو کہ تم کس کے ساتھ دوستی کر رہے ہو۔ تم جس کسی سے بھی دوستی کرو اس میں پانچ صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

اول یہ کہ یہ شخص صاحب عقل و فہم ہو کیوں کہ احمق کی صحبت سے کسی طرح کی بھلائی حاصل نہیں ہوگی۔ اور آخر کار وحشت و حیرانی

ہوگی۔ اور ترکِ تعلقات کی نوبت آجائے گی۔
احمق کے ساتھ دوستی کی سب سے بہتر حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کرے اور وہ اسی جذبہ کے تحت ایسا کام کر بیٹھتا ہے کہ جس سے تمہیں نقصان وزیاں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور وہ یہ جانتا بھی نہیں کہ اپنے اس کام کی وجہ سے تمہیں کیا نقصان پہنچ رہا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔

دوم یہ کہ وہ شخص نیک خصلت اور اچھی عادت کا مالک ہو۔ کیوں کہ بُری عادت والے کے ساتھ دوستی بہت دشوار ہے اور اس کے ساتھ گزر بسر نہیں ہوگا اور اس کی بدخوئی یہ ہوتی ہے کہ حرص اور غضب کے وقت اپنے آپ میں نہیں رہتا۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ دوستی ایسے شخص کے ساتھ کرو جس کے ساتھ مل بیٹھنے سے تمہیں آرام و آسائش حاصل ہو۔ اور کام کے وقت میں وہ تمہارا معاون و محافظ ہو اور ضرورت وحاجت کے وقت وہ تمہارے لیے خزانہ ثابت ہو۔

دوستی ایسے شخص کی اختیار کرو کہ اگر تم کوئی کام کرو تو وہ تمہارا ساتھ دے اور تمہارے اندر کوئی نیکی دیکھے تو اس سے متاثر ہو اور تمہارے اندر کوئی برائی اور عیب دیکھے تو اس کو چھپا دے۔

دوستی ایسے شخص کی اختیار کرو کہ اگر تم کوئی بات کرو تو وہ تمہاری تصدیق کرے۔ اگر کوئی کام پیش آئے تو تمہیں اپنا امیر بنائے اور تم کو کوئی رنج اور تکلیف پہنچے تو خود کو تمہارے لیے سپر بنائے اور کوئی راحت پہنچے تو تم پر ایثار کرے (اور یہ دعویٰ نہ کرے کہ راحت میرا حصہ ہے۔)

علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں:
برادرِ حقیقی تو وہ ہوتا ہے جو تمام کاموں میں تمہارے ساتھ رہے اور تمہارے نفع کے واسطے خود رنج و مشقت اٹھائے اور اگر تمہیں کوئی ضرورت پیش آئے تو اپنی ضرورت کو چھوڑ کر تمہاری ضرورت کو پورا کرنے میں کوئی خوف اور تردد محسوس نہ کرے۔

سوم یہ کہ اس کے اندر نیکی اور صلاح کی صفت ہو کسی مفسد اور فاسق شخص کے ساتھ دوستی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ جو شخص اللہ تعالےٰ سے نہیں ڈرتا اس کے شر اور فتنہ سے بچ نہیں سکتے اس لیے کہ جب اس کی غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ بھی بدل جاتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ کسی کبیرہ گناہ پر ہمیشگی اختیار نہیں کرتا بلکہ گناہ کا دیکھنا بھی نقصان وزیاں کا باعث ہوتا ہے، اگرچہ کہ تم دل میں گناہ کو ناپسند کرتے ہو لیکن جب بہت سارے گناہوں کو دیکھتے رہو گے تو دل بھی اس گناہ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور تم پر اس گناہ کا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غیبت کرنا، نیک لوگوں کے لیے سونے کی انگوٹھی اور ریشم کا لباس

پہننے سے زیادہ آسان ہے۔ حالاں کہ غیبت بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن غیبتیں سُن سُن کر اور غیبت کرنے والوں کو دیکھ دیکھ کر غیبت کرنا ان کے لیے بھی آسان ہو جاتا ہے۔

چہارم یہ کہ اس کے اندر دنیا کی حرص وطمع نہ ہو کیوں کہ ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنا جس کے اندر دنیا کی محبت ہو زہر قاتل ہے۔ جو شخص زاہدوں کی صحبت میں رہتا ہے تو اس کے دل میں دنیا حقیر ہو جاتی ہے اور جب اہلِ دنیا کی صحبت میں رہتا ہے تو اس کے دل میں دنیا شیریں و محبوب ہو جاتی ہے

اور آدمی کی طبیعت دوسروں کی ریس کرنے کی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر ایک استر کو دوسرے استر کے ساتھ ملا کر رکھا جائے تو اگر وہ ہم رنگ نہ ہو جائیں تو ہم خو اور ہم عادت ضرور ہو جائیں گے اسی طرح ایک دوست کی خصلت دوسرے دوست کی عادت بن جاتی ہے۔ کیوں کہ آگ کے نزدیک رہنے والی چیز اس کی حرارت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

پنجم یہ کہ اس کے اندر راست گوئی کی عادت ہو۔ کیوں کہ دروغ گو کی صحبت سے کوئی راحت اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ جو بھی کہتا ہے اعتماد اور بھروسہ کے قابل نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام خصلتیں اور عادتیں ایک ہی شخص میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ اگر یہ ساری باتیں کسی شخص میں تلاش کرتے رہیں تو ایک دوست بھی نصیب نہیں ہوگا اور تنہا زندگی گزارنا پڑے گا۔ یا ہر شخص کے ساتھ اس کی خصلت اور عادت کے مطابق دوستی کرنی ہوگی۔

دوست تین ہیں۔

ایک آخرت کے واسطے ہے۔ ایسے دوست میں دین اور ورع و تقویٰ کے سوا کوئی دوسری چیز تلاش نہیں کرنی چاہیے۔

دوسرا دنیا کے واسطے ہے اس میں نیک خو اور اچھی خصلت تلاش نہیں کرنی چاہیے۔ اور

تیسرا انس و محبت اور زندگی گزارنے کے واسطے ہے ایسے دوست پر نگاہ رکھنا چاہیے تاکہ تم اس کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ سکیں۔

کہا گیا ہے کہ لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک غذا کی طرح ہیں، جن سے کنارہ کشی ممکن نہیں، دوسرے دوا کی طرح ہیں جن کی کبھی کبھی ضرورت پیش آتی ہے۔

تیسرے بیماری کی طرح ہیں جو کسی کام کے نہیں۔ جب اس قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آجائے تو صبر کرنا چاہیے۔ اور ان کی خاطر مدارت کرنی چاہیے تاکہ ان سے پیچھا چھڑا سکیں۔ اور اس قسم کے لوگوں کی صحبت بھی فائدہ سے خالی نہیں کیونکہ عقل مند شخص جو بھی برائی دیکھتا ہے اس سے خود

کو علاحدہ کرلیتا ہے۔ نیک بخت آدمی وہ ہے جو دوسروں سے پندونصیحت حاصل کرے۔ ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ یعنی ہراچھائی اور برائی کا جائزہ دوسروں کی اچھائی اور برائی سے لیا کرتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ آپؑ نے ادب کس سے سیکھا؟ جواب دیا ہر آدمی سے۔ کیوں کہ جس شخص میں بھی مجھے کوئی برائی نظر آئی تو میں اس برائی کو برا سمجھنے لگا۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر لوگ دوسرے میں کوئی برائی دیکھیں اور اس برائی سے کنارہ کش ہونے لگیں تو خود بخود باادب اور بااخلاق ہوجائیں گے۔

مجہول اشخاص کی صحبت کے آداب

نامعلوم اشخاص کی صحبت کے آداب دوسرے ہیں۔ امام غزالی 'زادالآخرت' میں لکھتے ہیں کہ :-
غیر متعارف پراگندہ حال اشخاص کے ساتھ صحبت کے آداب یہ ہیں کہ ان کی گفتگو میں شامل نہ رہو۔ اور ان کی ناشائستہ باتوں کو نہ سنو اور ان کو دوسروں کے سامنے نہ بیان کرو اور ان کی ناہموار باتوں سے خود کو علاحدہ رکھو۔ اور کوشش کرو کہ تم ان کے حاجت مند نہ رہو۔ اور ان سے ربط و ضبط اور تعلق کم رکھو۔ اور ان کی ناشائستہ حرکت یا بے ہودہ بات دیکھو اور سنو تو لطف و مہربانی کے ساتھ نصیحت کرو۔ اگر تمہیں امید ہو کہ وہ قبول کرلیں گے۔

لوگوں کے ساتھ صحبت وآداب

امام غزالیؒ "زاد الاخرت" میں فرماتے ہیں کہ ایک حکیم نے اپنے شاگرد کو یہ آداب سکھلایا اور وصیت کی کہ تمہیں چاہیے کہ جب تم لوگوں کے ساتھ بیٹھو اٹھو تو دوست اور دشمن کے ساتھ خود کو خندہ رو اور کشادہ ابرو رکھو اور لوگوں کے ساتھ رعایت وحسنِ سلوک اور لطف ومہربانی سے پیش آؤ نہ اس طرح کہ خود کو ذلیل وخوار کرلو اور نہ اس طرح کہ ان کو ذلیل وخوار کرو، لیکن وقار وبردباری اور تواضع وانکساری کے ساتھ تکبّر ومذلت کے بغیر رہو۔ اور تمام کاموں میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔ نہ اس طرح افراط اور مبالغہ سے کام لو کہ حد سے متجاوز ہو جاؤ اور نہ اس طرح تفریط اور تقصیر سے کام لو کہ اس میں بھی حد سے متجاوز ہو جاؤ۔ اور جب راہ چلو تو خود نمائی سے بچو۔ اور سیدھے اور بائیں دیکھتے نہ چلو۔ اور کسی مقام پر لوگوں کی جماعت دیکھو اور ان کے ساتھ بیٹھنا ہے تو خاموش بیٹھ جاؤ اور اُکھڑ پنجوں کے بل مت بیٹھو اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں مت ملاؤ۔ داڑھی اور انگشتری سے مت کھیلو۔

اور لوگوں کے سامنے ناک میں انگلیاں نہ ڈالو اور دانتوں میں خلال نہ کرو اور نہ تھوکو اور اپنے سامنے سے مکھیوں کو اڑانے کے لیے بار بار ہاتھ نہ ہلاؤ اور لوگوں کے سامنے جمائی نہ لو اور اپنی تعریف مت کرو۔ اور اپنی بات کو آہستہ اور سلیقہ وترتیب کے ساتھ کہو اور کوئی بات پراگندہ ومنتشر انداز میں نہ کہو اور کوئی بات بھی اچھی ہو تو اس کو توجہ اور خوشی کے ساتھ سنو۔ بات بات پر اس درجہ تعجب کا اظہار نہ کرو کہ ہنسی آجائے۔ مخاطب سے بار بار بات کو دھرانے کا مطالبہ نہ کرو اور ایسی بات سے پرہیز کرو جس سے ہنسی آجائے۔ اور اپنی تعریف اور اپنے بچوں کی تعریف اور اپنے شعر وتصنیف کی تعریف مت کرو۔ اور جو چیز بھی تم سے تعلق رکھنے والی ہے اس کا اظہار نہ کرو اور عورتوں کی طرح خود کو نہ سنوارو اور خود کو غلاموں کی طرح میلے کچیلے ذلیل وخوار بنائے نہ رکھو۔

اور جس شخص سے بھی اپنی کوئی حاجت بیان کرو تو پوری کرنے کے لیے بے حد اصرار نہ کرو اور کسی شخص کا ذکر اس کے ظلم اور معصیت کے ساتھ نہ کرو۔ اور کسی کے سامنے اپنے مال ودولت کی مقدار نہ بیان کرو اور یہ چیز اپنی بیوی بچوں سے بھی پوشیدہ رکھو۔ اس لیے کہ اگر تمہارے مال کی

مقدار کم ہے تو تم ان کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ گے اور اگر تمہارے مال کی مقدار زیادہ ہے تو تم کبھی ان کی رضا اور خوش نودی حاصل نہ کر سکو گے اور ان کے ساتھ سختی کے بغیر وقار کے ساتھ زندگی گزارو اور ایسی نرمی سے پیش آؤ جس میں کمزوری و ذلت نہ ہو۔

نوکروں، بچوں اور شاگردوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور تمسخر نہ کرو۔ تاکہ تم ان کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل نہ ہو جاؤ۔ اور جب کسی کے ساتھ دشمنی ہو جائے تو تیزی مت بتاؤ اور اپنی زبان کو قابو میں رکھو اور اپنی بات کو حجت و دلیل کے ساتھ کہو اور اسی وقت کہو جب کہ تمہارے پاس قوی دلیل ہو۔ اور گفتگو کے درمیان ہاتھ نہ ہلاؤ اور دوزانو ہو کر نہ بیٹھو۔ اور جب تک غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے کسی بات چیت میں دخل نہ دو۔

اگر بادشاہ تم کو اپنا مصاحب اور مقرب بنالے تو غرور میں مبتلا نہ ہو جاؤ بلکہ اس کے ساتھ بہت احتیاط اور خوف کے ساتھ رہو اور اس تعلق پر اعتماد نہ کرو۔ اور اپنے مال کو اپنی ذات سے زیادہ عزیز نہ رکھو۔ تمہاری خوش حالی کے زمانے میں دوستوں سے پرہیز کرو کیوں کہ جب تک تمہارے نزدیک مال و دولت ہے اور عزت و حشمت ہے وہ تمہارے دوست بنے رہیں گے اور تمہاری مفلوک الحالی اور مصیبت کے زمانہ میں تم سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ انتہی۔

بہت سے لوگ صحبت اور ہم نشینی کے آداب اور طور طریقوں سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ایذا و تکلیف کا باعث ہوتے ہیں اور ان کے درمیان اختلاف و تفریق کا سبب بنتے ہیں ضروری ہے کہ مسلمان اس بری بلا یعنی ایذائے مسلم اور تفریق و اختلاف سے خوف کھائیں اور شریعت مطہرہ کے اصول و قواعد کی روشنی میں صحبت کے آداب اور طور طریقوں سے واقفیت حاصل کریں۔ ٭٭

آداب صحبتِ شرعیہ میں سے جو گذشتہ فائدے میں گزر چکے ہیں زبان سے السلام علیکم کہنا بھی اسلام کا عظیم ترین شعار ہے۔ لیکن اس دیار وامصار کے سرمایہ دار اور بڑے لوگ اغنیاء و اکابر چھوٹوں کی زبان سے لفظ السلام علیکم کو انتہائی بے ادبی اور بہت ہی بدتمیزی خیال کرتے ہیں۔ اور لفظِ سلام کے عوض پشت خم کرنے کو اور دوسرے غیر شرعی آداب و طریقوں کو کمالِ ادب اور انتہائی تمیز کی بات خیال کرتے ہیں۔

شیخ الہند "شرح سفر السعادۃ" میں فرماتے ہیں کہ سلام جو ملّتِ اسلامی کا عظیم ترین شعار ہے جیسا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ اور سارے مسلمان کی عادت سے ثابت ہے اور قرآنِ کریم کی آیتِ کریمہ: ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنًا سے بخوبی واضح ہے۔ اسلام کا یہ عظیم شعار ہندوستان کے شہروں میں پوری طرح متروک اور مہجور ہو چکا ہے۔ اور کمر و پشت خم کرتے ہوئے جھک کر تسلیم بجالانا جو اہلِ بدعت کا شعار ہے، سلام کا قائم مقام بن چکا ہے اور ہندوستان کے بعض شہروں میں سلام کا طریقہ سر پہ ہاتھ رکھنا اور انگلیوں کو زمین پر ٹیکنا پھیل چکا ہے۔ اکثر لوگوں کے نزدیک زبان سے السلام علیکم کہنا سوء ادبی اور بدتمیزی میں شمار کیا گیا ہے۔ لہٰذا اربابِ حکومت اور حکامِ ریاست کی لازمی ذمہ داری ہے کہ سلام کا طریقہ عام کرنے میں انتہائی درجہ کی سعی و کوشش کریں اور اس مقصد کی تکمیل میں تمام تر کوششیں اور محنتیں صرف کریں۔ اور اسلام کے اس عظیم ترین شعار کو زندہ کرنے میں لطف و مہربانی سے کام لیں اور احیائے سلام کو عظیم ترین قربِ خداوندی اور نجات کا شریف ترین ذریعہ اور رب الارباب کی قربت کا عظیم ترین سبب سمجھیں۔

ہندوستان کے علمائے کرام نے مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنّت کو زندہ کرنے میں اور اسلام کے اس عظیم شعار کو پھیلانے میں انتہائی کوششیں صرف کیں۔ لیکن بے دیانت حکام اور متکبر امراء (العادۃ طبیعۃ خامسۃ) کے حکم کے تحت ہندوستانیوں کی عادت کے مطابق لفظِ سلام کے دشمن تھے۔ انہوں نے خود کو شریعت کے تابع نہیں کیا اور عادت پسند عوام بھی الناس علی دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے پر گامزن رہا کرتے ہیں) کے حکم کے تحت بدعت کی عادت کی پیروی کرنے والے اور طریقِ سنّت کے دشمن تھے اور علمائے دین دار اس عموم بلوٰی (وہ مصیبت و مشکل جس میں سبھی گرفتار ہیں) سے ناچار اور بے بس ہو گئے۔ لیکن انگریزوں کے اس دورِ اقتدار میں جس میں مسلمانوں کی عادت زائل اور ان کی حکومت زوال پذیر تھی۔ دین داروں کی ایک جماعت نے سلام کی سنّت کو زندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہاں تک کہ سلام کی سنّت عوام و خواص کی نظروں میں آفتاب رابعۃ النہار کی طرح پورے کمال کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ لیکن اربابِ ولایت اور حکامِ ریاست نے خود کو احیائے سلام کی کوششوں سے الگ رکھا۔ تو سلام کی سنّت گنتی کے چند نیک اشخاص ہی میں پھیل سکی۔

احیائے سلام پر قابو پانے کے ان دنوں میں عزت و وجاہت کے متلاشی جاہلوں اور کبر و نخوت خو غالیوں کا ایک گروہ خطابت و موعظت کے شرائط اور تقاضوں سے عاری اور غالی وعظ کے منبر پر بیٹھ کر اور مشیخیت و سجادگی کے لوازم کے بغیر مسندِ ارشاد پر جم کر من لم یوقر کبیرنا (جو بزرگوں کی توقیر نہ کرے وہ ہمارے میں سے نہیں ہیں۔) والی حدیث کے اظہار سے باز نہ رہا اور مصافحہ، دست بوسی، قدم بوسی اور بزرگوں کے تمام آداب کی مشروعیت کے اعلان کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اور افشوا السلام بینکم (تمہارے درمیان سلام پھیلاؤ) کی حدیث کو پھیلانے اور اہلِ عرب کی عادات کو عام کرنے اور انحنا و پشت خم کرنے اور زمین بوسی سجدہ تعینات (مثلاً سوم، دسواں، بیسواں) و مزامیر کی برائی کو ناجائز قرار دینے کا بیانگِ دہل اقدام کر دیا۔ (یعنی یہ لوگ مذکورہ اشیاء پر ہی زور دیتے رہے ہیں۔) نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عوام حرام نوکری اور دیگر حرام کمائیوں، ناجائز کھانے پینے فرض نمازوں کو ترک کرنے، سود خواری، ریش تراشی اور دیگر غیر شرعی امور کو حساب میں ہی نہیں لا رہے ہیں، لیکن مکروہات اور غیر مکروہ کھانوں اور غیر تائب اشخاص کی مجالس میں جو محرمات سے بالکل خالی ہیں شرکت کرنے کو شدید ترین حرام

خیال کر رہے ہیں۔ اور اس حلال کو حرام قرار دینے کے ساتھ ساتھ خود کو بزرگانِ دین اور رب العلمین کے مقربین خیال کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ عزّت کے طالب افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت، سلام کے پھیلانے کو اپنی دین داری کے لیے ڈھال بنا کر لفظِ سلام کی آڑ میں آباء و اجداد، مشائخ واساتذہ، ساداتِ کرام اور تمام اکابر و امجاد کے ساتھ لفظِ سلام سے پیش آ کر اپنے ہمسروں اور ساتھیوں کا معاملہ کر کے عدمِ تعظیم و توقیر غیر شرعیہ کے مرتکب ہو رہے ہیں اور سلام کی سنّت ادا کرنے کے پردہ میں تکبر و فساد کی داد دے رہے ہیں۔ اور دست بوسی و قدم بوسی کو جھکنے کو بھی ناجائز خیال کر رہے ہیں۔

طرفہ یہ کہ قدم بوسی کی مشہور سنّت کو ایک مرتبہ والی سنّت (یعنی وہ عمل جو حضورؐ کی زندگی میں صرف ایک مرتبہ کیا گیا ہو) کہہ رہے ہیں۔ اور ایک مرتبہ والی سنّت کی پیروی کا انکار کر رہے ہیں۔ حالاں کہ مطلقاً سنت کا انکار کرنا اور اس کو حقیر و معمولی تصوّر کرنا کفر ہے۔ خواہ وہ سنّت ایک مرتبہ کی گئی ہو یا مکرر و سکرر اور یہ انکار جو برائی اپنے اندر رکھتا ہے خوب ظاہر ہے۔

اس بارے میں امیر المومنین حضرت عمرؓ کا فیصلہ زبان زد جمہور ہے جو ایک مسلمان اور یہودی کے درمیا پیش آیا تھا۔ اور طرفہ یہ ہے کہ مجالس و محافل میں داخل ہونے والے شخص کے لیے قیام کرنے کو فرضِ عین کی طرح خیال کر رہے ہیں۔ حالاں کہ امام غزالی اور دیگر جلیل القدر علماء کے نزدیک بدعت ہے۔ جیسا کہ گذشتہ فائدہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اور قیام نہ کرنی کی صورت میں اپنی نیک عزت سمجھتے ہیں اور انتہائی غیض و غضب کی وجہ سے اُن کے چہرے خون کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس موقعہ پر یہ لوگ اہلِ عرب کی عادت اور عہدِ نبوت کے طریقہ کو یک قلم فراموش کر دیتے ہیں۔ زبان پر بھی نہیں لاتے۔ سبحان اللہ! اس افراط و تفریط کے باوجود اپنی طرف عوام کے دلوں کو مائل کرنے کے لیے اور ان سے فوائد و منافع حاصل کرنے کے لیے بلند دعوی کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے مکر و فریب سے جاہلوں کو اپنا معتقد بنا رہے ہیں۔ اور خود کو متقی و پرہیزگار اور متبعِ سنّت کہہ رہے ہیں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا الخ

حاصلِ کلام!

واعظینِ خام کا بھی فساد بہت ہے یہی وہ مقام ہے کہ شیخ عطار نے 'تذکرۃ الاولیاء' میں لکھا ہے کہ:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بصرہ تشریف لائے اور حکم صادر فرمایا کہ منابر توڑ ڈالیں اور واعظین کو وعظ کرنے پر پابندی عائد کر دی اور

حضرت حسن بصری کی محفل میں تشریف لے گئے اور انھیں وعظ گوئی سے منع نہیں کیا اور فرمایا: یہ جوان شائستہ سخن ہے اور پھر واپس چلے گئے۔

اور اسی طرح نا اہل سجادہ نشین حضرات کا فساد بھی بے شمار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیار نے دہلی میں ایک سجادہ نشین عالم کو جو نفس و شیطان کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا اور صاحبِ فنا و بقا نہیں تھا، مسندِ سجادگی سے اٹھا دیا اور بیعت کرانے پر پابندی عائد کرادی غرض شیطان، نفسِ بدانجام کے ساتھ اسی سلام کی سوراخ کے ذریعہ خانۂ اسلام میں داخل ہوا اور مسلمانوں کے درمیان وسیع پیمانہ پر اختلاف و پھوٹ اور لڑائی دشمنی پیدا کر دیا۔ اور ہر کس و ناکس کو ابھار دیا کہ وہ اتباعِ سنّت کے دعوے کے ساتھ مشائخ، علماء، سادات صلحاء، اساتذہ، آبا و اجداد اور دوسرے واجب الاحترام بزرگوں کے ساتھ ان کے علم و فضل کی جانب التفات کئے بغیر برادرانہ تعلقات اور ہمسروں سے ملنے جلنے کی طرح صرف لفظ اسلام سے پیش آئیں۔ اور مصافحہ، دست بوسی، قدم بوسی تواضع، خاکساری اور دیگر آدابِ شرعی اور صحبت کے فوائد و برکات جو گزشتہ فائدے میں گزر چکے ہیں ان سب سے باز رہے۔ اور مجسم نخوت کی طرح نظروں میں دکھائی دے۔

پس سلام پھیلانے کا حکم جو شارع علیہ السلام نے مسلمانوں میں باہمی الفت و محبّت پیدا کرنے کے واسطے صادر فرمایا تھا وہ دشمنی عداوت کے پیدا کرنے میں تبدیل ہوگیا۔ اور اللہ کی رضا شیطان کی رضا سے بدل گئی اور لوگوں کے درمیان خصوصًا عزّت پسند، مغرور افراد اور عادت پسند عزت مند اشخاص کے درمیان سخت دشمنی اور مخالفت وقوع پذیر ہوگئی۔ اِس حد تک کہ باپ بیٹے میں جدائی، میاں بیوی میں علاحیدگی ہوگئی۔ اور ہر ایک دوسرے کے شکست کے درپے ہوگیا۔ اور مسلمانوں میں اختلاف و تفرقہ جو دشمنانِ دین کی سب سے بڑی آرزو اور اہم مدعا ہے، معمولی توجہ اور ایک پائی خرچ کئے بغیر آسانی کے ساتھ انگریزی حکام کو حاصل ہوگئی۔ مسلمان چوں کہ بے بس ہیں اور ان کا کوئی فریاد رس نہیں ہے جو اُن کے فساد کی اصلاح کرسکے اور ہر شخص کو شرعی احکام کی حد میں رکھے اِس لاچار صورتِ حال میں مسلمانوں کو اپنے باہمی تنازعات اور مخاصمات میں انگریزوں کی عدالت کی جانب رجوع کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اور انگریزی حکام اجنبیت، مسافرت اور زبان و ملّت کی مغائرت و مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کے فساد کی اصلاح کی طاقت نہیں رکھتے تھے مجبورًا انھوں نے اہلِ خصومت کی اصلاح و تادیب کے عوض

قید اور جرمانہ کا حکم دینا شروع کر دیا۔ معاذ اللہ من ذلک۔

اگر سلام بزرگانِ کرام کے آداب شروع کے ساتھ ملا اور مجڑا ہوا ہوتا تو ان شرور مفاسد کی گنجائش نہ رہتی۔

فلاسفۂ اسلام، اہلِ اسلام کے زمرہ میں داخل ہونے کے باوجود اپنی خود رائی سے عقول نفوس ہیولی، صورت اور افلاک وما فیہا کے قدیم ہونے کی رائی رکھتے تھے۔ لہذا آسمان کے پھٹ جانے اور ستاروں کے منتشر ہوجانے کا انکار کر بیٹھے حالاں کہ آسمان میں شگاف اور ستاروں میں انتشار کا واقع ہونا نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔ اسی لیے امام غزالیؒ نے رسالہ 'منقذ' میں فارابی' ابنِ سینا اور دیگر فلاسفۂ اسلام کی تکفیر کی ہے۔

غرض فلاسفہ اپنی خود رائی کی وجہ سے گم راہی وضلالت کی وادی میں بھٹک گئے اور ایک عالم کو بھی دینِ حق کے صراط مستقیم سے برگشتہ کر دیا۔ ھلکوا فاھلکوا۔ خود ہلاک ہو گئے اوروں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اور اسی طرح معتزلہ بھی خود بینی کی وجہ سے سنّت جماعت کے راستہ سے برگشتہ ہو کر ایک عالم کی گم راہی وضلالت کا باعث بن گئے ضلوا فاضلوا خود گم راہ ہوئے اوروں کو بھی گم راہ کر دیا۔

علّامہ تفتازانی نے شرحِ عقائد نسفی میں لکھا ہے کہ

رئیس المعتزلہ واصل بن عطا، حضرت حسن بصریؒ کی مجلس سے کنارہ کش ہوا، اس حال میں کہ وہ ثابت کرتا تھا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے اور نہ کافر اور مرتکب کبیرہ کے لیے دو مرتبوں کے درمیان ایک مرتبہ ثابت کرتا تھا اس پر حضرت حسن بصری نے کہا: وہ ہم سے علاحدہ ہو گیا۔ اسی واقعہ سے واصل بن عطا اور اس کے ہم عقیدہ افراد معتزلہ کے نام سے موسوم اور مشہور ہو گئے۔ اور یہ لوگ خود کو اصحابِ عدل وتوحید کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اصحابِ عدل کی توجیہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک طاعت کرنے والے کو ثواب اور گناہ کرنے والے کو عذاب دینا اللہ پر واجب ہے۔ اور اصحاب توحید کی توجیہہ یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالٰے سے صفاتِ قدیمہ کی نفی کرتے ہیں۔ یعنی صفات عین ذات ہیں پھر معتزلین علمِ کلام میں پوری طرح مشغول ہو گئے اور اصول واحکام میں اور بہت سی چیزوں میں فلاسفہ کی اتباع کرنے لگے۔ اور ان کا مذہب لوگوں میں مشہور ہو گیا۔ یہاں تک کہ شیخ ابوالحسن اشعری نے اپنے استاذ شیخ ابوعلی جبائی سے کہا کہ ان تین بھائیوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے، جن میں ایک طاعت کی حالت میں مر گیا۔ دوسرا معصیت کی حالت میں مر گیا اور تیسرا

نابالغی کی حالت میں مرگیا۔

جبائی نے کہا پہلے کو ثواب میں جنّت دی جائے گی اور دوسرے کو دوزخ میں عذاب دیا جائے گا اور تیسرے کو نہ ثواب دیا جائے گا اور نہ عذاب دیا جائے گا۔

اس پر ابوالحسن اشعری نے فرمایا: پس اگر تیسرے نے یہ کہا کہ اے میرے رب! تو نے مجھے بچپن ہی میں موت کیوں دی اور کیوں زندہ نہ رکھا۔ یہاں تک کہ میں بالغ ہوجاتا اور تجھ پر ایمان لاتا اور تیری طاعت کرتا اور جنّت میں داخل ہوجاتا؛ تو اس پر اللہ تعالیٰ کیا کہے گا؟

جبائی نے کہا: اللہ تعالیٰ یہ کہے گا کہ میں تجھ سے بہتر جانتا ہوں۔ اگر تو بالغ ہوجاتا تو ضرور نافرمانی کرتا اور دوزخ میں داخل ہوتا۔ تیرے لیے یہی بہتر تھا کہ تو بچپن ہی مرجائے۔

اس پر اشعری نے کہا:

پس اگر دوسرا یہ کہے کہ اے میرے رب تو نے مجھے بچپن ہی میں موت کیوں نہ دی تاکہ میں تیری نافرمانی نہ کرتا اور نہ دوزخ میں داخل ہوتا تو اللہ تعالیٰ کیا کہے گا۔

پس جبائی مبہوت اور لاجواب ہوگیا۔

اور ابوالحسن اشعری نے اس کے مذہب کو ترک کردیا۔ آپ اور آپ کے متبعین معتزلہ کے مذہب کی تردید و ابطال میں مشغول ہوگئے اور جو چیز سنّت سے وارد ہے اس کو ثابت کرنے میں منہمک ہوگئے اور حضرات صحابہؓ کی روش پر چلنے لگے۔ اور یہ حضرات سنّت نبوی اور جماعتِ صحابہ کے طریقے کو اختیار کرنے کی وجہ سے اہلِ سنّت و جماعت سے موسوم ہوگئے۔

مولوی دہلوی ’صراطِ مستقیم‘ کے پہلے باب کے آخر میں راہِ ولایت اور راہِ نبوت کی بحث کے بعد لکھتے ہیں کہ:

کتاب و سنّت کا علم حاصل ہوجانے کے بعد یہ دقیق علوم بعض ذہین لوگوں کے حق میں اکسیرِ اعظم کا درجہ رکھتے ہیں کیوں کہ یہ علوم و معارف انھیں منصب امامت اور وراثتِ نبوت کا مقام بخشتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب کتاب و سنّت حدِ تواتر اور منتہائے شہرت پر پہنچ گئے۔ اور خاص و عام میں سے ہر ایک اپنے اپنے حصّے کی مقدار بقدر میں ان سے فائز اور بہرہ ور ہوگیا۔

کتاب و سنت کو تسلیم کرنا تسلیم اولیات کے رنگ میں تمام مسلمانوں کے قلوب میں جگہ پکڑ لیا تو

پس یہ علوم دقیقہ، فنون عربیہ کے اساتذہ، آئمۂ اجتہاد، دانش ورانِ علم کلام اربابِ تہذیبِ اخلاق اور اصحابِ شریعتِ محمدیہ کی مساعی جمیلہ سے بروئے کار آئے اور یہ

اکابر حضرات ان ہی مساعی جمیلہ کی بدولت علماءِ امتی کانبیاءِ بنی اسرائیل، کے زمرے میں سمجیح مقام پا گئے اور ان مباحث کے پھیلانے میں اُن کے متبعین نے مساعی جمیلہ کام میں لائے یہاں تک کہ مفصل و دقیق علوم و فنون وجود میں آ گئے۔

ان بزرگوں کا دورِ برکت نشان ختم ہونے کے بعد نام کے مقلدین کی ایک جماعت ظہور میں آئی جس کی طبیعت میں اقتدار کی طلب اور عزت کی ہوس رچی بسی تھی۔ پس اس جماعت نے اسی بے معنی قیل وقال اور مکابرہ وجدال کو فضل وکمال سمجھ لیا۔ اور کتاب وسنت کو پس پشت ڈال دیا اور اپنی تمام عمر کو ان بے فائدہ امور کو حاصل کرنے میں ضائع کر دیا۔ اور فلسفہ واعتزال کی راہ پر گامزن ہو گئی اور اس جہانِ فانی سے حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہ کیا۔ اور بالآخر اپنی تنگ قبر میں ناکامی و نامرادی اور نقصان وخسران کے سوا کچھ نہ پایا۔ اور نہ کوئی مونس نصیب ہوا۔

قل ھل ننبئکم بالاخسرین الایۃ

العیاذ باللہ! اللہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ان جاہلوں کے انجام سے بچائے۔

۲۲ واں فائدہ

تصوّف وصوفی اور ان دونوں کے متعلقات

شیخ وجیہہ الدین گجراتی "حقیقتہ محمدی" میں سید الطائفہ جنید بغدادی سے نقل کرتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ حق تعالیٰ تجھ کو تجھ سے ختم کر دے اور تجھ کو خود سے زندہ کر دے۔ غیر سے قطع نظر کرتے ہوئے۔

اس سے صوفی کا معنی و مفہوم بھی واضح ہو چکا ہے کہ وہ فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہوتا ہے اور قرآنِ کریم میں صوفی کا اسم متروک ہے۔ تصوّف کے بیان میں صوفی سے ہماری مراد مقرب (الٰہی) ہے۔ متر سّم (ظاہری رسوم کا پابند) نہیں اصطلاحی الفاظ میں کوئی نزاع نہیں ہے۔

جیسا کہ قدوۃ السالکین، عمدۃ الکاملین، العالم الربّانی شیخ شہاب الدین سہروردی نے "عوارف" کے پہلے باب میں تحریر کیا ہے:

جان لو! بے شک ہم اس کتاب میں جو بھی بزرگ و شریف حال صوفی کی جانب منسوب کریں گے وہ مقرب کا حال ہوگا اور قرآنِ کریم میں لفظِ صوفی نہیں ہے اور اسمِ صوفی متروک ہے اور صاحبِ تقرب کے لیے مقرب وضع کیا گیا ہے اور ہم اس کی تشریح و توضیح اسی باب میں کریں گے اور بلادِ اسلامیہ کے مشرقی و مغربی شہروں کے دونوں جانب بھی اہلِ قرب و اصحابِ تقرب کے لیے صوفی کا نام معروف و مشہور نہیں ہے بلکہ یہ نام ان لوگوں کے لیے مشہور ہے جو صوف کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ کپڑے دھو کر پہنتے ہیں اور سر مونڈھتے ہیں۔

اور مغرب، ترکستان، ماوراء النہر کے شہروں میں بے شمار اہلِ قرب موجود ہیں۔ لیکن وہ صوفیا کے نام سے یاد نہیں کئے جاتے۔ اس لیے کہ یہ حضرات صوفیوں کے لباس میں نہیں ہوتے اور اصطلاحی الفاظ میں کوئی نزاع نہیں ہے۔

پس اسی سے یہ بات جان لینی چاہیے کہ صوفیا مقربین سے ہماری مراد مشائخ صوفیا ہیں۔ جن کے اسمائے گرامی طبقات اور دیگر کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ سب کے سب مقربین کے طریقہ پر گامزن ہیں۔ اور ان کے علوم و عوارف مقربین کے علوم و عوارف ہیں۔ اور جو شخص بھی مقربین کے مقام پر فائز ہے وہ ابرار میں سمجھا جائے گا۔ اور

وہ متصوف ہوگا۔ جب تک اس کے حال کا تحقق نہ ہو اور جب اس کا حال متحقق ہو جائے تو وہ صوفی ہوگا اور ان دونوں کے علاوہ جو بھی مقربین کے لباس سے مزین ہو اور ان کی جانب منسوب ہوا تو وہ ان کے مشابہ اور مماثل ہوگیا۔

دفوق کل ذی علم علیم : انتہی

پس اس سے یہ حقیقت بھی جان لینی چاہیے کہ تصوف ایک ایسا علم ہے جن کا تعلق علوم دین بلکہ خلاصۂ علوم دین سے ہے۔ کیوں کہ وہ مجتہدان باطن کے اجتہاد و استنباط سے مستنبط ہے اور اس کو علم باطن بھی کہتے ہیں اور علم ظاہر کے ساتھ اس کی نسبت بالکل اسی طرح ہے جس طرح جسم کے ساتھ روح کی نسبت اور پوست کے ساتھ مغز کی نسبت ہوتی ہے۔ اور اس کی تفصیل "فصل الخطاب کے مقدمہ ثانیہ میں گزر چکی ہے۔

زبدۃ العارفین شاہ کمال فرماتے ہیں:

منغز علوم فقہ وحدیث وکتاب ہے
یہ علم[1] مغز فقہ وحدیث وکتاب کا

یہ بھی جان لیا جائے کہ صاحب کشف المحجوب نے ائمۂ صوفیا جو صحابۂ کرامؓ میں اہل بیت اور اصحاب صفہ ہیں، تابعین، تبع تابعین اور متاخرین میں جو اُن کے زمانہ تک وجود میں آئے۔ ان سب کے حالات قلمبند کیا ہے اور مذکورہ جمیع طبقات میں سے ہر ایک طبقہ کے بیان میں ایک ایک باب تحریر کیا ہے۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزار

ائمۂ صوفیا کی تفصیل اسی کتاب میں دیکھ لی جائے۔ اور یہ کتاب تصوف میں مشہور و معروف ہے اور علماؤ عرفار کے نزدیک مستند ہے۔

شیخ شہیر عارف بے نظیر علی بن عثمان ابن علی جلّابی، جنھوں نے ۴۶۴ھ میں وفات پائی "کذا فی النفحات وسفینۃ الاولیار" کی تصنیف ہے۔

تصوّف کی ماہیت اور آداب صوفیار اور دونوں کے متعلقات کے بارے میں فصل الخطاب کے دوسرے، پانچویں، آٹھویں، دسویں، گیارھویں اور بارہویں مقدمہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ ان موضوعات کی تفصیل فقیر کی کتاب "جواہر السلوک" میں دیکھ لی جائے۔

حاصل کلام!

جو بھی شخص اہل سنّت کے عقائد حقہ، سلف و ائمۂ سلف کے طور طریقے، صوفیا کی اصطلاحات اور اس عالی مقام جماعت کے حالات سے واقف نہ ہو اور امام غزالیؒ، شیخ ابن عربی، صدر الدین قونوی کی کتابیں اور شیخ سہروردی کی کتاب 'عوارف' اور شیخ ابو بکر کی کتاب 'تعرف' اور مولانا روم کی مثنوی

---

[1] علم تصوّف

اور امام ربّانی کے مکتوبات کا مطالعہ نہ کیا ہو تو اس کا قدم لغزش سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور اس کو مذکورہ اکابرین کی کتابوں کے مطالعہ کے بغیر حقیقتِ واقعہ تک پہنچنا مشکل اور دشوار ہوگا۔

اس مقام میں بعض عوام کی افراط و تفریط بہت ہے۔ چناں چہ کبھی علمِ باطن کا انکار کر دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس طرح کا انکار فرقۂ حشویہ کا باطل عقیدہ ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل "فصل الخطاب" کے آٹھویں مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ یہ وضاحت وہاں دیکھ لی جائے۔

کفارِ قریش بھی قرآنِ مجید کے باطنی نکات اور پوشیدہ معانی کا انکار کرتے تھے اور قرآن کو اساطیر الاولین (گزرے ہوئے لوگوں کے قصّے و کہانیاں) کہا کرتے تھے۔

مثنوی

چوں کتاب اللہ بیامد ہم براں | ایں چنیں طعنہ زدند آں کافراں
جیسے قرآن آیا یونہی اس زماں | مارتے تھے طعنے اس پہ کافراں

کہ اساطیر است افسانہ نثر ند | نیست تعمیقی و تحقیقی بلند
کہ اساطیر اور قصے ہیں ذلیل | نہ ہیں نکتے اور نہ تحقیقِ جلیل

ظاہر ست و ہر کسی پی می برد! | کو بیاں کہ گم شود در وے خرد
ہے وہ ظاہر کہ ہر ایک سمجھے اسے | کب ہے مشکل عقل جو اس میں گمے

گفت گر آساں نماید ایں بتو | ایں چنیں سورہ یکی آساں بگو
بولا اگر آساں تمہیں معلوم ہو | ایسی آساں ایک سورۃ تم کہو

ظاہرش دیدے زمعنی غافلی | باطنش راکن نگہ گر عاقلی
تو اس کے ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس کے باطن سے غافل ہے۔ اگر تو عاقل ہے تو اس کے باطن کو دیکھ

حرف قرآں را بداں کہ ظاہر است | زیر ظاہر باطنی بس قاہر است
حرف قرآں کو تُو ظاہر جان لو | نیچے اس ظاہر کے باطن ہے نکو

زیر آں باطن بود بطنی دگر! | ہم چنیں تا ہفت بطن اے نام ور
اس کے باطن میں ایک دوسرا باطن ہے۔ اے نامور اس طرح ہفت بطون ہیں

زیر بطن تانیش بطنِ سیوم | کہ درو گردد خرد یا جملہ گم!
نیچے اس باطن کے باطن تیسرا | ہے خرد گم اس میں از سر تا بپا

بطنِ چہارم از نبی خود کس ندید | جز خدائے بے نظیر و بی ندید
دیکھا چوتھا بطن قرآن بیشتر | نہ کسی نے جز خدائے بے نظر
تو ز قرآں ای پسر ظاہر مبین ! | دیو آدم را نہ بیند جز کہ طین
ظاہر مت دیکھ قرآں سے پسر | دیکھتا ہے دیو مٹی سے بشر
ظاہر قرآں چو نقش آدمی است | کہ نقوش ظاہر و باطن خفی است
آدمی نزدیک عاقل ہے خفی | کب کھلی جو غیب میں ہو وصفی
تو مبین زا فسون عیسیٰ حرف وصوت | آں ببیں کزوے گریزاں است موت
دیکھ مت عیسیٰ کے دم حرف وصوت | دیکھ وہ کہ بھاگتی ہے اس سے موت
ایں سخن ہمچوں عصائے موسیٰ است | یا بمانند فسون عیسیٰ است
آدمی مثل عصا موسیٰ کے ہے | آدمی مثل دم عیسیٰ کے ہے
تو مبین موسیٰ عصی را سہل یافت | آں ببیں کہ بحر اخضر را شگافت
دیکھ مت اب اس عصا کو سہل تو | دیکھ وہ کہ پھاڑے بحر نیل کو
ظاہرش چوبے ولیکن پیش او | کون یک لقمہ چو بکشاید گلو
ظاہر الاٹھی واس کے روبرو | یہ جہاں اک لقمہ جو کھولے گلو

علامہ قیصری مقدمہ شرح قصیدۂ تائیہ فارضیہ کے مقصد ثانی کی پہلی فصل میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب قرآنِ کریم کے لیے ایک ظاہر، ایک باطن، ایک حد اور ایک مطّلع ہے جیسا کہ زبانِ نبوتؐ نے فرمایا :
بے شک قرآن کے لیے ایک ظاہر ہے، ایک باطن ہے، ایک حد ہے، ایک مطّلع ہے۔ نیز ارشادِ نبویؐ ہے بے شک قرآن کے لیے ایک مفہوم باطن ہے اور اس مفہوم باطن کے لیے بھی ایک باطن ہے، جس میں ساٹھ بطون ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ستّر بطون ہیں۔

تو اس کا ظاہر یہ ہے کہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے جو مفہوم اور معنی سمجھ میں آجائے اور اس کی طرف ذہن منتقل ہو جائے۔ ظاہری معنی و مفہوم کے لیے جو مفہومات لازمہ ہیں یہ اس کا باطن ہے۔ اور جہاں عقول و فہوم کے ادراک کی انتہا ہوتی ہے یہ اس کی حد ہے۔ اور کشف و شہود کے طریقے سے جن اشارات ربانیہ اور اسرارِ الٰہیہ کا ادراک کیا جائے یہی اس کا مطّلع ہے اور مفہوم اول یعنی اس کا ظاہر عوام و خواص کے لیے ہے اور مفہوم اول کے لیے جو مفہومات لازمہ ہیں وہ خواص کے لیے ہیں۔ اس میں عوام کا دخل نہیں

اوراس کی حد کاملین کے لیے ہے اور مطلع اخص الخواص کے لیے، جیسے اکابر اولیاء۔

اور حدیث قدسیہ اور کلمات نبویہ میں تقسیم ایسی ہی ہے۔ بلا شبہ ان احادیث میں عوام خواص اور اخص الخواص کے لیے رحمانی خبریں اور الٰہی اشارات ہیں۔ اس لحاظ سے شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔

اسی سے علم باطن کی حقیقت جان لینا چاہیے۔ علامہ میبذی 'فواتح' کے پہلے فاتحہ میں لکھتے ہیں کہ شیخ ابنِ عربی نے فتوحات کے ۳۲ ویں باب میں لکھا ہے کہ شیخ ابو یزید نے ابو موسیٰ سے کہا اے ابو موسیٰ! جب تم کسی کو اربابِ طریقت کی باتوں پر ایمان رکھنے والا پاؤ تو اس سے دعا کی درخواست کرو۔ کیوں کہ اس کی دعا بلا شبہ مستجاب ہے۔ اسی سے بارگاہِ رب العزت میں ارباب طریقت کی قدر و منزلت اور جاہ و عزت کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اور کبھی عوام علم تصوّف کو فلاسفہ سے ماخوذ کہتے ہیں۔ کیوں کہ صوفیا فلاسفہ کی طرح ارواح و قلوب کو عقول و نفوس کہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ مسلمان عیسائیوں کی طرح دعا کی قبولیت کے مقام میں آمین کہتے ہیں۔ بلکہ آمین کہنا نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد سنّت گردانتے ہیں حالانکہ یہ چیز عیسائیوں سے نہیں لی گئی۔

اور اسی طرح مسلمان دنیا کے اکثر فرقوں کی طرح عالم کو حادث جانتے ہیں۔ حالاں کہ انہوں نے یہ اعتقاد دوسرے فرقوں سے نہیں لیا۔ اور اسی طرح مسلمان حالتِ احرام میں مشرکوں کی طرح برہنہ سر ہوتے ہیں اور نشیب و فراز میں بلند آواز سے پکارتے ہیں اور سر منڈواتے ہیں، حالاں کہ انھوں نے ان امور و اشغال کو بت پرستوں سے نہیں لیا۔

صرف ارواح و قلوب کو عقول و نفوس کے لفظ سے تعبیر کرنے کی بناء پر علم تصوف کو فلاسفہ سے ماخوذ کیوں سمجھ لیا جائے۔ بے شک یہ ایک افترار ہے۔

پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے پادریوں میں سے ایک پادری اُلف ہے جس نے رسالہ میزان الحق میں مومنوں کو گمراہ کرنے اور انہیں ذہول و لغزش میں مبتلا کرنے کے لیے دین اسلام پر طعن کیا ہے اور ان افترا پردازوں کی طرح اس افترار میں لب کشائی کیا ہے۔ کہ وضو میں کہنیوں تک ہاتھ دھونے کا حکم آتش پرستوں سے لیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ وحی الٰہی کا حکم ہے جس میں باطل کی آمیزش کی گنجائش ہی نہیں:

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید

ــــــــ

لوح محفوظ است اورا پیشوا
از چہ محفوظ است محفوظ از خطا
نی نجوم است و نہ رمل است و نہ خواب
وحیٔ حق و اللّٰہ اعلم بالصواب

ترجمہ: لوح محفوظ اس کا رہنما ہے اور جو کچھ اس میں محفوظ ہے وہ خطا اور غلطی سے محفوظ ہے اور یہ نجوم، رمل اور خواب نہیں ہے، بلکہ وحی الٰہی ہے و اللّٰہ اعلم بالصواب۔

اور کبھی عوام مسئلہ وحدت الوجود کو آتش پرستوں سے ماخوذ کہتے ہیں، حالاں کہ اس مسئلہ کے قائل اہل سنت و جماعت میں صوفیا وجودیہ اور ائمۂ متکلمین ہیں بلکہ اہلِ قبلہ میں اکابر شیعہ مثلاً نصیر الدین طوسی، علامہ میبذی اور صدر شیرازی بھی اس مسئلہ کے قائل ہیں۔ چناں چہ طوسی کی کتاب "اوصاف الاشراف" میں اور میبذی کی کتاب "فواتح" میں اور شیرازی کی کتاب "شواہد الربوبیہ" میں مرقوم ہے۔ اہلِ قبلہ ہی نہیں بلکہ غیر اہلِ قبلہ میں بھی بعض حکما اس مسئلہ کے قائل ہیں۔

صاحبِ رشحات کے کلام کا ماحصل جو انہوں نے ملا عبد الغفور کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت شیخ ابنِ عربی اور ان کے متبعین اور متقدمین و متاخرین میں اکثر صوفیا محققین و متقین اور حکما و متکلمین میں سے چند افراد اس مسئلہ کے قائل ہیں۔ اگر آتش پرستوں میں سے کوئی دانش مند شخص حکماء کی طرح اس مسئلہ کا قائل رہا ہو تو اس بات کی گنجائش ہے اور ان تمام آرار و افکار کے اندر مختلف گروہ اتفاقِ رائے رکھتے ہیں لیکن ہر رائے اپنی جگہ ایک مستقل رائے ہے نہ کہ دوسروں سے ماخوذ۔ اس اتفاقِ آرار کی وجہ سے مسئلہ وحدۃ الوجود کو آتش پرستوں سے ماخوذ قرار دینا کلام بے سند اور قولِ بے دلیل ہے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

اور کبھی وحدۃ الوجود کے باطل ہونے اور وحدۃ الشہود کے مبنی بر حقیقت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چناں چہ ابو سعد کا رسالہ اس دعویٰ کی دلیل ہے۔ اور کبھی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دونوں کے باطل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہر دونوں کو بدعتِ ضلالت کہتے ہیں۔ چناں چہ ترجمۂ ایضاح الحق اس مدعیٰ کی دلیل ہے۔ اور کبھی مسئلہ وجود میں متکلمین کے حق و صواب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حلول کو وجودیہ کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ اور ان کو کافر و گم راہ کہتے ہیں، حالاں کہ وجودیہ خود حلولیہ کی تکفیر کرتے ہیں۔

اور یہ غالی اشخاص نہیں جانتے ہیں کہ وجودیہ، شہودیہ اور متکلمین یہ تینوں اہلِ سنت و جماعت میں شامل ہیں اور اہلِ سنت کے اختلافی مسائل مظنون الافادہ یعنی ان کی افادیت ظنی ہے

اور حق ان اختلافی مسائل میں دائر ہوتا ہے۔ مجتہد ہی کو ایک جانب کا یقین میسر نہیں ہے تو مقلد کو کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اور کبھی مسئلہ وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود تنزلات ستہ، صادر اول، تجدد امثال، کمون، بروز اور ان کے امثال کو جو تصوف کے اہم مسائل ہیں، بدعت سیئہ کہتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بدعت واجبہ ہے اور بعض اہل علم کے قول کے مطابق بدعت مندوبہ ہے چناں چہ اس کی تفصیل فصل الخطاب کے نویں مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ ہاں! اتنی بات درست اور صحیح ہے کہ ان دقیق مسائل میں تحقیق و تفتیش عوام کے لیے مذموم اور قبیح ہے۔

سند العلماء شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سورہ تساءل کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اس سورۃ میں مقصود بیان یہ ہے کہ حقائق امور اخرویہ، مباحث ذات و صفات، مسئلہ قضا و قدر جبر و اختیار، توحید وجودی، توحید شہودی، مشاجرات صحابہ اور احکام شرعیہ کی حکمتیں جو لوگوں کی عقل و فہم سے بالاتر اور ان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہے ان مسائل کے بارے میں زیادہ سوالات کرنا نہایت قبیح ہے اور مذموم ہے۔ اس لیے کہ لوگ (ان حقائق کے دقیق معنی نہ سمجھنے کی بنا پر) انکار کر بیٹھتے ہیں۔ ورنہ کم از کم (یہ مسائل و مباحث) اکثر کے ذہن میں تشکیک کا باعث ہوتے ہیں۔ حالاں کہ ایمان ان چیزوں سے متعلق زیادہ تحقیق و تفتیش کرنے اور ان امور و مسائل کی کمیات و کیفیات کی تفصیلات جاننے پر موقوف نہیں ہے اور یہی وہ خطرناک مرض ہے جو اس امت میں گم راہ فرقے بندی اور عقائد میں بگاڑ کا باعث بن کر ایک عالم کے ایمان کو برباد کر دیا ہے غرض اللہ نے مذکورہ سورت میں اس صورت حال (مذکورہ الصدر مسائل و امور میں تحقیق و تفتیش اور کثرت سوال و جواب بحث و مباحثہ) کی قباحت بیان کی ہے تاکہ لوگ اس قسم کے مسائل میں الجھنے سے احتراز کریں۔ اور گم راہی و ضلالت کے بھنور میں نہ پھنس جائیں۔ انتہی

نیز ایک سائل کے جواب میں سند العلماءؒ لکھتے ہیں کہ:

یہ مسئلہ یعنی مسئلہ وحدت الوجود کا تعلق اسرار سے ہے۔ شرائع اور ادیان اس مسئلہ کے جاننے پر موقوف نہیں ہے بلکہ عوام کو اس مسئلہ کی تعلیم دینا الحاد کا دروازہ کھولنے اور شرور و فساد کو مباح کرنے اور احکام شرعیہ کی پابندی میں بے پروائی اور مداہنت کا باعث بن جاتا ہے۔

پس اس مسئلہ کی نزاکت و دقت اور باریکی کی وجہ سے اس کا اظہار و بیان ممنوع ہے اور اس باب میں سکوت و خاموشی کو واجب جانتے ہیں۔

جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔

جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو خاموش

رہو اور جب میرے اصحاب کا ذکر ہو تو خاموش رہو اور جب نجوم کا ذکر ہو تو خاموش رہو۔

معلوم ہوا کہ ایسے دقیق مسائل میں تحقیق و تفصیل کے درپے ہونا خود گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا سبب بنتا ہے۔ یہی متکلمین محققین کا موقف ہے۔ اس احتیاط کے ساتھ ساتھ اس جماعت نے اپنی کتابوں میں اس مسئلہ پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے۔ جیسے غزالی، رازی اور ان کے علاوہ اس فن کے دیگر ائمہ۔ اگر اس مسئلہ کی تفصیل اور توضیح مطلوب ہو تو کتاب "تنبیہ المحجوبین" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انتہی۔

اور اسی کا حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ گمراہ فرقوں میں خوارج اور روافض کا افتراق مشاجرات صحابہ کی وجہ سے ہے۔ اور قدریہ اور جبریہ کا مسئلہ قضا و قدر کی وجہ سے ہے۔ اور منکرین و ملحدین کا مسئلہ وحدۃ الوجود کی وجہ سے ہے اور باقی فرقوں کو اسی پہ قیاس کر لیا جائے۔

اور کبھی عوام قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور ان کے مثل دوسرے سلاسل کے اشغال اور اعمال کو بدعتِ ضلالت کہتے ہیں۔ حالاں کہ مولوی خورم علی نے "شفاء العلیل" ترجمہ "قول الجمیل" میں ان خیالات کی تردید کی ہے۔

٭ وگاہی اشغالِ طریقۂ قادریہ و چشتیہ و نقشبندیہ و امثالہا را بدعتِ ضلالت خوانند حال آں کہ مولوی خورم علی در شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل میگوید۔

مترجم کہتا ہے حضرت مصنّف محقق کا کلام دلپذیر اور تحقیق عدیم النظیر سے شبہات ناقصین کی جڑ سے اکھاڑ دیا۔ بعضے نادان کہتے ہیں کہ قادریہ اور چشتیہ اور نقشبندیہ کے اشغال مخصوصہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں نہ تھے تو بدعت سئیہ ہوئے خلاصۂ جواب یہ ہے کہ جس امر کے واسطے اولیاء طریقت رضی اللہ عنہم یہ اشغال مقرر کئے ہیں وہ امر زمانِ رسالت سے اب تک برابر چلا آیا ہے گو طرق اس کی تحصیل کے مختلف ہیں تو فی الواقع اولیاء طریقت مجتہدین شریعت کے مانند ہوئے مجتہدین شریعت نے استنباطِ احکام ظاہر شریعت کے اصول ٹھرائے اور اولیاءِ طریقت نے باطنِ شریعت کی تحصیل کی جس کو طریقت کہتے ہیں۔ قواعد مقرر فرمائے تو یہاں بدعتِ سئیہ کا گمان سراسر غلط ہے۔ ہاں یہ البتہ ہے کہ حضرات صحابہ کو بہ سبب صفائی طبیعت اور حضور خورشید رسالت کی تحصیل نسبت میں ایسے اشغال کی حاجت نہ تھی بخلاف متاخرین کے کہ اون کو بسبب بعد زمانِ رسالت کی البتہ اشغال مذکورہ کی حاجت ہوی جیسے صحابۂ کرام کو قرآن اور حدیث کی فہم میں قواعدِ صرف و نحو کی دریافت کی حاجت نہ تھی اور اہلِ عجم اور بالفعل کے عرب اوس کے محتاج ہیں۔" انتہی

اگر یہ ساری چیزیں بدعتِ ضلالت ہیں تو پھر یہ بات قابلِ غور ہے۔ کیوں کہ صوفیا کی کتابیں اور منکروطاعن اشخاص کے مشائخ و بزرگوں کی کتابیں خصوصًا مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب "قول الجمیل" اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کی کتاب "صراط مستقیم" باب سوم مختلف سلاسل کے اشغال سے بھری پڑی ہیں۔

اورعوام کبھی مقاماتِ عالیہ، وارداتِ قلبیہ اور حالاتِ قدسیہ کو امور سئیہ خیال کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ سب امور دینیہ میں سے ہیں۔ چناں چہ اس کی تفصیل فصل الخطاب کے دوسرے مقدمہ میں گزر چکی ہے۔

اور کبھی ولایت کو پانچویں صدی ہجری سے منقطع قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ ولایت کا سلسلہ تا قیامِ قیامت جاری رہے گا۔ مولانا شاہ اسماعیل دہلوی صراط مستقیم کی تالیف کے اسباب میں کتاب کے آخر میں ذکر کرتے ہیں کہ:

اہلِ زمانہ کی جاہلانہ معتقدات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ولایت کو ممتنعاتِ عقلیہ میں شمار کرتے ہیں اور اس چیز کو امت کے اولین افراد میں منحصر گرداننتے ہیں۔ اور ختم نبوت کی طرح ختم ولایت کے قائل ہیں۔ ؎

ہر چہ دارد از ثریا تا ثرے !
می سپارو زین یکے با دیگرے
پس بہر دوری ولی قائم است
تا قیامت آزمایش دائم است

ترجمہ:۔ ثریا سے تحت الثریٰ تک جو کچھ موجود ہے وہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہیں۔ پس ہر دور میں ایک ولی ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ دائم ہے۔

اور کبھی اولیاء کرام کی بے خودی اور سُکر کا انکار کرتے ہیں اور تمسخر و استہزا کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ سُکر خانہ خراب مجموعات اور دفاتر کی تصنیف و تالیف اور کتابوں کے ابواب و فصول کی ترتیب میں مانع کیوں نہیں ہے۔ حالاں کہ امام ربّانی مکتوبات کی جلدِ سوم میں اکہتّرویں مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ فقیر یہ دفاتر و مجموعات اس عالی قدر جماعت (صوفیاء) کے علوم و اسرار میں تحریر کیا ہے ظاہرًا تمہارے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہ سب سکر و بے خودی کی آمیزش کے بغیر صحوِ خالص کے عالم میں تحریر کیا ہے۔ یہ بات اس طرح ہرگز نہیں کیوں کہ وہ حرام اور منکر ہے اور دروغ و سخن بافی ہے۔ سخن باف اشخاص جو صحوِ خالص سے متصف ہیں بالضرور اس قسم کی باتیں گھڑتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں کو حق تعالیٰ کی جانب سے پھیر دیتے ہیں۔

آخر حافظ کی یہ ساری فریاد بیہودگی

اور غلط بیانی نہیں ہے۔ یہ تو قصۂ غریب اور حدیثِ عجیب ہے "

یہ تمام غلو اس بات سے آگاہ کر رہا ہے کہ غالی اشخاص صوفیائے کرام کے علوم و معارف سے بالکلیہ واقف ہی نہیں ہیں۔ صوفیانہ علوم و عوارف سے لاعلمی و بے خبری جس قدر بھی ہو ایک بری بات ہے۔ لیکن ان کا انکار کرنا تو ایک بہت بڑی بری بلا ہے۔ اور عظیم وبال ہے۔ چناں چہ اس کی تفصیل فصل الخطاب کے تیرھویں اور سولھویں مقدمہ میں دیکھ لی جائے۔

امام ربانی کی مکتوبات کی دوسری جلد کے ۵۵ ویں مکتوب میں اس طرح کے غالی اشخاص کے بارے میں فرماتے ہیں:

کوتاہ نظر اور ناقص افراد چند حدیثوں کو یاد کر کے احکامِ شرعیہ کو ان ہی میں منحصر قرار دیتے ہیں اور اپنی معلومات کے ماسوا اور ماوراء کی نفی کرتے ہیں اور جو بھی چیز ان کے نزدیک ثابت نہ ہو اسکی نفی کرتے ہیں۔

وہ کیڑا جو کسی پتھر میں پوشیدہ ہوتا ہے
اسی چٹان کو اپنی زمین و آسمان خیال کرتا ہے

۲۳واں فائدہ

صوفیاء کے ساتھ مولانا شاہ ولی اللہ کے اختلافات

مولانا دہلوی رسالہ "مقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیہ" میں "الوصیۃ الرابع" میں فرماتے ہیں: جان لینا چاہیے کہ ہمارے اور اس دور کے مشائخ کے درمیان اختلاف ہے۔ صوفی منش حضرات کہتے ہیں کہ فنا وبقا اور استہلاک و انسلاخ ہی اصل مقصود اور مطلوب ہے۔

اور کسب و معاش کی مراعات اور طاعات بدنیہ کو بجالانے سے متعلق جو بھی شرعی احکام وارد ہیں وہ اس واسطے ہے کہ تمام اشخاص اصل مطلوب اور مقصود کو پا نہیں سکتے۔ ہر وہ چیز جس کو پوری طرح حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کو پوری طرح سے ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

متکلمین کہتے ہیں کہ شریعت کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ شئے مطلوب اور مقصود نہیں ہے، اور ہم کہتے ہیں کہ انسان کی صورت نوعیہ کے اعتبار سے مقصود و مطلوب شریعت کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ یعنی شریعت ہی اصل ہے اور شارع علیہ السلام نے اس اصل مطلوب کا بیان خواص وعوام دونوں کے لیے کر دیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوع انسان کی تخلیق اس طرح عمل میں آئی ہے کہ وہ قوتِ ملکیہ اور بہیمہ دونوں کی جامع ہے اور انسان کی سعادت و نیک بختی قوتِ ملکیہ کو طاقت پہنچائے میں ہے اور اس کی شقاوت و بدبختی قوتِ بہیمیہ کو طاقت پہنچانے میں ہے۔

نوعِ انسان کی تخلیق ایک ایسے طریقے پر ہوئی ہے کہ اس کا نفس اعمال و اخلاق کی زنگا رنگی کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اپنی طبیعت میں شامل کر لیتا ہے اور موت کے بعد ان اعمال کو اپنی ہمراہی اور مصاحب بنا لیتا ہے یعنی ساتھ لے جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ اس کا بدن غذا کی کیفیات سے تمتع حاصل کرتا ہے۔ اور اپنا ساتھی اور مصاحب بنا لیتا ہے اور اس سے بدہضمی اور بخار وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور نوع انسان کی تخلیق ایک ایسے طریقہ پر واقع ہوی ہے کہ حظیرۂ قدس کے ساتھ اس کا لحوق اور حظیرہ قدس سے اس کا الہامات حاصل

ممکن ہے اور ان اشیاء کا حصول بھی ممکن ہے جو الہام کے حکم میں داخل ہے۔ یعنی انسان کا سرور و بہجت حاصل کرنا اگر اس کو ملائکہ سے مناسبت ہو، تنگی اور وحشت سے دوچار ہونا اگر اس کو ملائکہ سے منافرت ہو۔

حاصلِ کلام! نوعِ انسان اس طرح واقع ہوئی تھی کہ اگر انسانوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو امراضِ نفسانیہ اکثر افراد کو الم و تکلیف پہنچاتے حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کی کارسازی فرمایا ہے۔ اور ان کے واسطے نجات کی راہ متعین کیا ہے۔ اور ترجمانِ لسانِ غیب حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی کی جنس سے پیدا فرما کر ان کی جانب بھیجا تاکہ نعمت مکمل ہو اور ربوبیت الٰہیہ جو پہلی مرتبہ ان کے ایجاد کی مقتضی تھی۔ دوسری بار ان کا ہاتھ تھامے رہے۔

پس صورتِ نوعیہ نے زبانِ حال سے شریعتِ مطہرہ کو مبدأ فیاض سے بھیک مانگ لیا ہے۔ اور نوعِ انسان کے جمیع افراد کو شریعت کا حکم ماننا ان میں صورتِ نوعیہ کے گھل مل جانے کی وجہ سے لازم اور ضروری ہے۔ اور اس مقام میں افراد کی خصوصیت کو کوئی دخل نہیں ہے اور فنا و بقا اور استہلاک وغیرہ باعتبار خصوصیتِ افراد مطلق اور مقصود ہیں۔ کیوں کہ بعض نفوس انتہائی علو و تجرد کے مرتبے میں مخلوق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اونچے درجہ کے موافق ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور فنا بقا وغیرہ احکام الٰہیہ میں سے نہیں ہیں بلکہ اس فرد کی زبانِ حال نے اس کی انفرادیت کی خصوصیت کی وجہ سے اس کا تقاضا کیا ہے۔ اور اس پر شارعؑ کا کلام ہرگز محمول نہیں ہے نہ صراحتاً اور نہ اشارۃً۔ ہاں! ایک قوم نے ان مطالب کو شارعؑ کے کلام سے سمجھا ہے جیسے اس کی مثال ایسے ہی ہے ایک شخص لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنے اور اس قصہ کی ہر بات کو اپنی سرگزشت پر محمول کرے، اس کو ان کے عرف میں اعتبار کہتے ہیں۔

حاصل کلام! استہلاک اور انسلاخ کے مقدمات میں افراط و زیادتی اور ان میں ہر کس و ناکس کا مشغول ہونا دین کے اندر ایک دردناک مرض ہے۔ خدا اس شخص پر رحم کرے جو مذکورہ مقدمات کو چھپا دینے کے لیے اپنی سعی اور کوشش کو کام میں لائے۔ بھلے سے وہ اپنے اندر بعض اصلی استعدادات ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔

ہرچند کہ میری یہ بات اس دور کے صوفیا کے لیے بڑی دشوار اور ناگوار سی ہوگی، لیکن مجھے ایک کام کا حکم دیا گیا ہے اور میں اسی کے مطابق کلام کروں گا۔ زید اور عمر سے کوئی سروکار نہیں۔

الطاف القدس میں فرماتے ہیں:

اس مقام پر عوام صوفیا کو ایک عظیم اشتباہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ

اعتبار کو معنی مدلول کے ساتھ مشتبہ بنالیے ہیں۔ اوران دونوں کے درمیان کوئی فرق وامتیاز کرنہیں پا رہے ہیں۔

اعتبار یہ ہے کہ عارف ایک آیت یا حدیث کو سن لیتا ہے تواس کا ذہن ایک ایسی معرفت کی جانب منتقل ہوتا ہے جو دلالتِ وضعی کے علاوہ ہے۔ دلالتِ وضعی جو عبارتِ نص اشاراتِ نص اوران کے شعبوں سے استدلال کا نام ہے۔ بلکہ اسی راہ میں (یعنی دلالت وضعی کے سوا) حدیثِ نفس میں دل میں آنے والی ایک بات دوسری بات کو کھینچ لاتی ہے اور ایک چیز سے دوسری چیز یاد آتی ہے۔ چناں چہ نیند اور بیداری کی حالت میں دل میں آنے والی باتوں کے انتقالات اسی نوع کے ہوتے ہیں جیساکہ یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ باقی انتقالات کبھی حدیثِ نفس ہوتے ہیں اور کبھی وسوسۂ شیطان اور کبھی خاطرِ عقل ہوتے ہیں۔ اور عارف کے حق میں ایسا الہام ہوگا جو مبنی برحق ہے اور ایسی تعلیم ہوگی جو مبنی برصواب ہے۔ اور اعتبار عارف کے مقام اوراس کے کلمے کی سماعت کرنے کے درمیان متولد ہوتا ہے۔ چناں چہ آپ نے تجربہ کیا ہوگا کہ قوال لیلیٰ و مجنوں کا قصہ پڑھتا ہے تو ایک عاشق کو اپنا دردبھرا قصۂ عشق اوراپنے محبوب کا اعراض کرنا، یا اس کا اقبال یہ ساری باتیں دل میں گزرتی ہیں اور اوراس کی یادوں کی جلو میں آجاتی ہیں اوراسی راہ سے عاشق کی لذتیں ابھرتی ہیں اوراس کے سوزشِ دل اور جوش و جذبے ابل پڑتے ہیں۔ حالاں کہ یہ قصہ خود کوئی مثل نہیں ہے اور نہ ہی اس قصے سے مستنبط ہے بلکہ اس قصہ کے کلمات سننے اوران کی سماعت سے نزدیکی کے باعث خود مستمع کے مقام سے اس کے محبوب کی یاد متولد ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے یہ بات واضح ہے کہ اعتبار کے اندر اصل شئے انتقالِ ذہن ہے نہ کہ دلالت کے طریقے۔

واضح ہو کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتبار کی صنعت کو تدبرِ قرآن کے وقت نگاہِ مبارک میں رکھا ہے اوراسی کے موافق قرآنِ پاک کی دریا کو سر کیا ہے۔

اور علمِ اعتبار ہماری اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔

حاصلِ کلام! یہ کہ اعتبار ایک عجیب و غریب اور قدر و قیمت والا فن ہے۔ تفسیر عرائس، حقائق سلمی اور شیخ اکبر محی الدین بن عربی اور شیخ سہروردی کا بہت سارا کلام اسی فنِ اعتبار سے متعلق ہے۔ انتہی

فوز الکبیر میں مرقوم ہے کہ صوفیاء کے اشارات اوران کے اعتبارات درحقیقت فنِ تفسیر سے تعلق رکھنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ استماعِ قرآن کے وقت سالک کے قلب پر بہت

سی چیزیں ظاہر اور منکشف ہوتی ہیں

اور نظم قرآن کے درمیان اور اس حالت کے درمیان متولد اور منکشف ہوتی ہیں جو کہ سالک رکھتا ہے یا جو معرفت کہ اس کو حاصل ہے اس سے متولد ہوتی ہیں جیسا کہ ایک شخص لیلی و مجنوں کا قصہ سنتا ہے اور اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے اور جو معاملہ کہ اس کے اور اس کی محبوبہ کے درمیان گزرا ہوتا ہے وہ اس کے ذہن پر مستحضر ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر ایک اہم فائدہ جان لینا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فنِ اعتبار کو مستند قرار دیا ہے اور اس راہ میں آپ نے سلوک فرمایا ہے تاکہ علمائے امت کے لیے سنت قرار پائے اور ان کے لیے علوم وہبی کا ایک دروازہ کھل سکے۔ انتہی۔

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی اس مقدمہ میں صوفیاء کے ساتھ مخالفت رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کے ہم عصر مشائخ ان کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے حتیٰ کہ ان کے شاگرد رشید قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی اُن کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان پر جرح کی ہے۔

چناں چہ وصیۃ رابعہ کی شرح میں اپنے استاد کے قول کی تردید میں اس طرح رقمطراز ہیں فقیر محمد ثناء اللہ کہتا ہے کہ شیخ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ صوفیاء فنا و بقا کو اصل مطلب اور مقصود جانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے فنا و بقا کو صرف خواص کے لیے مقرر کیا ہے اور عوام پر صرف ظاہر شرع کی پابندی لازم ہے اور متکلمین کہتے ہیں کہ شریعت کے ما سوا جو چیز بھی ہے وہ مطلوب و مقصود نہیں اور حضرت شیخ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ

ظاہر شرع کے تعلق سے متکلمین جس بات کے قائل ہیں وہ نوع انسان کی صورت کا مقتضی ہے اور نوع انسان کے جمیع افراد نوع کو شریعت کا حکم ماننا ان میں صورت نوعیہ کے گھل مل جانے کی وجہ سے لازمی ہے۔ اور افراد کی خصوصیت کو اس مقام میں کوئی دخل نہیں ہے اور فنا و بقا اور استہلاک وغیرہ جن کو صوفیا اصل مطلوب کہتے ہیں وہ بعض افراد کی خصوصیت کے اعتبار سے مطلوب اور مقصود ہے۔ اور یہ احکام الٰہی میں سے نہیں ہے یعنی اس کے تعلق سے شریعت خاموش ہے۔ بلکہ فردیت کی خصوصیت کی جہت سے زبان حال اس کا تقاضا کی ہے۔ اور اس پر شارعؑ کے کلام کو ہرگز محمول نہیں کیا جا سکتا نہ صراحتًا اور نہ اشارۃً لیکن کوئی بھی شخص اعتبار کے طریقہ سے سمجھ سکتا ہے۔

اس کلام کا خلاصہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شریعت ایک چیز ہے اور فنا و بقا وغیرہ مطالب صوفیاء ایک دوسری علاحدہ چیز ہے۔ جو شریعت

سے ماخوذ اور مستفاد نہیں ہے بلکہ اعتبار کے طریق سے مستفاد اور ماخوذ ہے

اور فقیر کے نزدیک حق یہ ہے کہ فنا و بقا وغیرہ مطالب صوفیا شریعت سے صراحت کے ساتھ ثابت ہیں۔ چناں چہ قابلِ اعتماد صوفیا کے مطالب چند ہیں:۔

(۱) ماسوا اللہ کے تعلق سے قلب کو پاک وصاف کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اس درجہ اس حد تک استہلاک کر اپنے نفس بلکہ ذکر کو بھی فراموش کر دے۔ اس حالت اور مقام کو تصوف کی زبان میں یادداشت دوام حضور اور فنا قلب کہتے ہیں اور شریعت کی زبان میں احسان سے تعبیر کرتے ہیں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو بلاشک و شبہ وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

مولانا روم اس حالت کے تعلق سے فرماتے ہیں:

صوفی کا مطلوب و مقصود ایک ہی حرف ہے۔ برف کی طرح پاک اور صاف و سفید دل کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس مقام سے متعلق سرورِ پیغمبران صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: آگاہ رہو بے شک انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ درست رہا تو سارا بدن درست رہے گا اور اگر وہ خراب ہو گیا تو سارا بدن خراب ہو گا۔ آگاہ رہو کہ گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے۔

اور یہ بات جو حدیث میں وارد ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہو جاتی ہے، اس کی ضد ہی قلب کی درستگی اور اصلاح ہے۔

(2) دوسرا تزکیۂ نفس ہے۔ یعنی نفس کو رذیل اخلاق سے پاک وصاف کرنا اور اس کو اوصاف حمیدہ سے آراستہ کرنا اس کو تصوف کی زبان میں فنائے نفس اور بقائے نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اخلاقِ رذیلہ کے حرام ہونے سے متعلق اور اخلاقِ حمیدہ کے واجب ہونے سے متعلق شریعتِ مطہرہ اس حد تک بآوازِ بلند ناطق ہے کہ اس کی نظر میں اخلاقِ حمیدہ کے بغیر اعمالِ جوارح کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ نماز اور اس کے مانند اعمال ریا کے ساتھ اخلاص کے بغیر لہو ہے اور اکثر مباح اعمال نیت نیک کے ساتھ اجر و ثواب کے مستحق ہیں اور قربِ الٰہی کے ان مقامات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خدارسیدہ صوفیاء جن کی تحصیل کی دھن میں لگے ہوئے ہیں،

پیغمبرِ اسلامؐ نے تنصیص فرمائی ہے کہ

لا یزال عبدی یتقرب (الحدیث) میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو دوست بنا لیتا ہوں۔ پس جب اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

اس حدیث کو ارباب وحدۃ الوجود اور اصحاب وحدۃ الشہود ہر ایک نے اپنے اپنے فہم و ذوق کے مطابق معنی پر حمل کیا ہے اور لا یزال کا کلمہ قرب کے درجات و مراتب کی عدم انتہا پر دلالت کرتا ہے۔ پس صوفیا رکے بہ مطالب شریعت سے صراحت کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں نہ کہ اعتبار کی راہ سے۔

پس متکلمین نے یہ جو بات کہی ہے کہ شریعت کے علاوہ جو بھی ہے وہ کوئی مطلوب اور مقصود شئے نہیں ہے، صحیح ہے۔ کیوں کہ بعض متکلمین نے بعض ایسی چیزوں پہ عمل نہیں کیا ہے جن کے متعلق شرعی احکام وارد ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو حج میسر نہیں ہوا۔ اسی طرح بعض لوگوں کو فناء نفس و قلب میسر نہ ہو سکا۔

اور صوفیا نے یہ بات جو کہی ہے کہ اصل مطلوب فنا و بقاء اور استہلاک ہے اور دیگر احکام جن کے متعلق شریعت ناطق ہے وہ اعتبار کے پہلو میں نہیں ہیں۔ یہ بھی حق اور صواب ہے۔ کیوں کہ نماز اور روزہ اخلاص کے بغیر کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے اور اسلام کے مراتب میں احسان کا مرتبہ شریعت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے صورت نوعیہ انسان جو زبانِ حال سے شریعت کو مبدا فیاض یعنی اللہ تعالی سے التماس کی تو سب سے پہلے فناء نفس و قلب ہی کو طلب کیا۔

گو کہ ظاہر میں بعض افراد کو یہ دولت میسر نہ ہوئی جیسا کہ بعض دوسرے افراد کو اعمالِ ظاہری بلکہ ایمان بھی میسر نہ ہوا۔

لقد خلقنا الانسان الآیۃ یعنی انسان کی استعداد بلند و برتر ہے۔ شریعت کا تقاضہ کرتی ہے۔ فی احسن تقویم اسی سے کنایہ ہے اور جب بعض افراد نے اس استعداد کو ضائع کر دیا تو اسفل السافلین میں بے عزتی کے ساتھ دھکیل دیے گئے۔

حاصلِ کلام! شیخ نے یہ بات کہی ہے کہ انسلاخ اور استہلاک کے مقدمات میں افراط اور ان میں ہر کس و ناکس کا مشغول ہونا، دین میں ایک مہلک اور سخت بیماری ہے۔ یہ بات فقیر کی فہم ناقص میں نہیں آرہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو یہاں تک کہ لوگ تم کو مجنون کہیں اور یہ حکم

جمیع افرادِ انسان کے لیے عام ہے۔ انتہی

مذکورہ توضیحات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک شریعت ایک چیز ہے اور فنا و بقاء وغیرہ مطالب صوفیاء ایک دوسری چیز ہے۔ جیسا کہ بعض متکلمین کا بھی یہی موقف ہے۔

اور قاضی صاحب کے نزدیک جس طرح متکلمین کے مطالب شریعت سے ماخوذ و مستفاذ ہیں اسی طرح صوفیاء کے مطالب بھی شریعت سے ماخود و مستفاذ ہیں۔ چناں چہ صوفیاء کرام کا موقف یہی ہے۔ اس لیے اکابر اولیاء اللہ اور شیخ جیلانی نے فتوح الغیب اور ملفوظات میں اور مولانا سند العلماء مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی نے تفسیر عزیزیہ میں اور مولانا اسماعیل دہلوی نے "صراط مستقیم" کے ابتدا میں مطالبِ صوفیہ کو باطن شریعت سے تعبیر کیا ہے۔

نیز مولانا دہلوی کے نزدیک مطالبِ صوفیہ شریعت سے صراحتاً نہیں نہ اشارةً بلکہ اعتبار کے طریق سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اور قاضی صاحب کے نزدیک مطالبِ صوفیاء شریعت سے صراحت اور اشارہ دونوں طرح ماخوذ ہیں۔ نیز مولانا دہلوی کے نزدیک افراد کی خصوصیت کو اصل اقتضاء میں دخل ہے۔

اور قاضی صاحب کے نزدیک کمالات کی تحصیل میں افراد کو اصل اقتضاء ہی میں شرکت ہے۔

نیز مولانا دہلوی مطالبِ صوفیاء کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کے قائل ہیں، لیکن قاضی صاحب ان کو آشکار کرنے کے قائل ہیں۔

اس لیے مختلف سلاسل کے مشائخ کبار و اولیاء کرام اور شیخ بہاؤ الدین زکریا، نظام الدین بداونی، نصیر الدین چراغ دہلوی، سید گیسو دراز بلکہ سید احمد مجاہد اور ان کے خلفاء وغیرہ نے بھی مطالبِ صوفیاء کو آشکار کرنے کا حکم دیا ہے اور عموماً لاکھوں کروڑوں اشخاص صوفیاء کے طریقہ میں بیعت کیے ہوئے ہیں اور ان حضرات کرام نے بھی افراد کی خصوصیت کا لحاظ کیے بغیر سارے لوگوں کو دعوتِ الی اللہ دی اور مطالبِ صوفیا کے سلوک میں مشغول کیا۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان صوفیاء نے کلموا الناس علی قدر عقولھم (الحدیث) لوگوں کے ساتھ ان کے عقل و فہم کے مطابق کلام کرو، کے مصداق استفادہ کرنے والوں کو عقل و فہم کے مطابق مسائل کو سمجھایا۔

حاصلِ کلام! یہ دونوں بزرگ مولانا دہلوی اور قاضی صاحب اگرچہ کہ ان امور میں باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن مطالبِ صوفیاء کی حقانیت اور ان کی صحت و درستگی سے متعلق دونوں متفق ہیں

اور اس بلند و برتر جماعت کے عالی مرتبت ہونے پر
اور اس کی بزرگی و شرافت پر بھی متفق ہیں۔
اس مقام میں بعض عوام افراط و تفریط
کا شکار رہیں اور عجیب و غریب راگ الاپ رہے ہیں
کبھی مطالب صوفیاء کو دین سے علاحدہ کرتے ہیں
اور ان حضرات کو بھی گمراہ کہہ دیتے ہیں جو ان مطالب
کے قائل ہیں۔ اور کبھی لفظِ اعتبار سے مراد معتبر کا اعتبار
کہتے ہیں۔ جو مولانا دہلوی کے کلام میں واقع ہے اور
کبھی مطالبِ صوفیاء کو غیر واقع اور بے حقیقت
خیال کرتے ہیں۔ مزید اس پر طرفہ یہ ہے کہ بعض
لوگ اس طرح کی راگ راگنی کے باوجود صوفیاء
کے طریقہ میں بیعت کرتے بھی ہیں اور بیعت
کراتے بھی ہیں۔ ان ھذا لشئ عجاب : بے
شک یہ بڑی عجیب بات ہے۔

ایک اہم فتویٰ

ادارہ

ذیل کا فتویٰ مجدد جنوب حضرت علامہ سید شاہ عبداللطیف قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ نے شہر رانی بنور ضلع دھارواڑ کے ایک امام و خطیب مولانا بڑے میاں صاحب کو دکھنی زبان میں روانہ فرمایا تھا۔ جس کی نقل من وعن ھدیۂ ناظرین ہے:

تمہیں پوچھے تھے کہ کسی نے یا اللہ، یا رسول اللہ میرے تئیں بیٹا یا بیٹی دیو کہے تو جائز ہے ہے یا نہیں؟ اور کہنے والا مشرک ہے یا نہیں؟

جواب اس کا یہ ہے کہ ایسا کہنا جائز نہیں اور کہنے ہارا مشرک ہے۔ اس لیے کہ پیدا کرنا اور بیٹا دینا مخصوص خدا ہی کا کام ہے۔ قال اللہ تعالیٰ اَفَمَنۡ يَّخۡلُقُ كَمَنۡ لَّا يَخۡلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (کیا جو شخص پیدا کرتا ہو وہ اس جیسا ہو جائے گا جو پیدا نہیں کر سکتا۔ پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے)

اور پیغمبران اپنے کو اولاد پیدا نہیں کر سکتے ہیں۔ دوسروں کو اولاد کیسا دیتے۔ آپ ہی پیدا کر سکتے ہیں تو خدا سے اولاد کی (کیوں) مانگتے۔ جیسے زکریا پیغمبر خدا سے فرزند مانگتے ہیں: فَهَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۙ يَّرِثُنِىۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ ۖ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا ۔

(اے میرے پروردگار مجھ کو اپنے پاس سے ایک وارث (بیٹا) عطا فرما جو میرے اور میرے جدّ امجد حضرت یعقوبؑ کے خاندان کے وارث بنے اور میرے رب اس کو اپنا پسندیدہ بنا۔)

پھر تمہیں پوچھے تھے کہ کسی نے بولے اللہ اور رسولؐ حاضر و ناظر ہے، ایسا بولنا جائز

ہے یا نہیں ؟

جواب اس کا یہ ہے کہ ایسا بولنا جائز نہیں اور بولنے والا مشرک ہے ۔ اس لیے کہ ہر جا حاضر اور ناظر رہنا مخصوص خدا ہی کا کام ہے ۔ اس کام میں کوئی مخلوق شریک نہیں ۔ 'بحر الرائق' اور 'عالمگیری' اور 'فصول عمادی' اور 'مختار الفتاوی' اور 'خلاصہ' اور 'خانیہ' میں ہے کہ کسی نے شہادت سے خدا اور رسول کے نکاح کیا تو صحیح نہیں بلکہ کافر ہو جاتا ہے ۔ کیوں کہ ہر جا حاضر و ناظر رہنے پہ یعنی غیب دانی پہ حضرت کے اقرار کرنا عالم الغیب کے فرمودہ سے یعنی لا یعلم الغیب الا اللہ سے منکر ہونا ہے ۔

پھر تمہیں پوچھے تھے کہ کسی نے یا اللہ یا رسول اللہ میرے تئیں روزی دیو کر کے کہے ایسا کہنا جائز ہے یا نہیں ؟ اور کہنے والا مشرک ہے یا نہیں ؟

جواب اس کا یہ ہے کہ ایسا کہنا بھی جائز نہیں اور کہنے والا مشرک ہے ۔ بشرطیکہ سرورِ عالم کو حقیقی روزی رساں اور مسبب جانے اور خدا کے ساتھ روزی رسانی میں شریک کرے ۔ اگر سرورِ عالم کو وسیلہ گردانے اور سبب روزی جانے تو یہ بات دوسری ہے ۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رسالہ 'حسنِ عقیدہ' میں فرماتے ہیں :

ولا یشفی مریضاً ولا یرزق رزقاً ولا یکشف ضراً الا ھو جمعنی انہ یقول لشیٔ کن فیکون بمعنی لا تسبب العادی الظاہری کما یقال تشفی الطبیب المریض ورزق الامیر الجند فھذا عندہ ۔ انتہی

فقیر در ایک کتاب فصل الخطاب بین الخطاء والصواب لکھا ہے ۔ مدراس میں چھپنے والی ہے ۔ اس میں ایسے مقدمات مفصلاً مذکور ہیں ۔ حق سبحانہٗ وتعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دیوے تا مذہب حقہ پہ سنت جماعت کہ قائم رہیں اور افراط و تفریط سے بچیں ۔

مرقوم : دہم محرم الحرام سنہ ۱۲۸۷ھ

مکتوبات

ترجمہ و تلخیص

مولوی حافظ ابو النعمان محمد بشیر الحق قریشی قادری استاذِ دار العلوم لطیفیہ ویلور

مجددِ جنوبِ ہند سلطان المرشدین

حضرت مولانا مولوی الحاج محی الدین سیّد شاہ

عبد اللطیف قادری المعروف بہ قطب ویلور

قدس سرہٗ

نے اپنے تلامذہ و خلفاء و مریدین معتقدین متعلقین و متوسلین

کے نام

فارسی میں خطوط تحریر فرمایا ہے۔ جن میں سے چند مکتوبات کا ترجمہ

حاضر ہے

ابو النعمان غفرلہٗ

مکتوب بنام نواب معتبر خان بہادر طاہر صفدر جنگ

سلام مسنون کے بعد خاطر شریف پر واضح ہو کہ نورِ چشم رکن الدین سید محمد مدعمرہٗ کی ولادت پر مبارک بادی سے متعلق ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۶۹ھ کا تحریر کردہ مکتوبِ گرامی نظر نواز ہوا اور آپ کی کرم فرمائی و یاد آوری سے ممنون و مشکور کیا اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری جانب سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ یہ التفات و مہربانی جو آپ دور افتادہ فقرا کے ساتھ فرماتے ہیں اور پورے اخلاص و محبت کے ساتھ کلام فرماتے ہیں امید ہے کہ۔ جز قربِ خداوندی کے حصول کا ذریعہ اور اس کے لطف و مہربانی کا سبب ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے ہر کام میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کے ساتھ خیر و احسان کا معاملہ فرمائے

میرے جدّا مجد و شیخ محترم حضرت سید شاہ عبداللطیف المعروف بہ محی الدین ذوقی چھیاسی سال قبل اپنے مراقبات میں ایک فرزند کی بشارت دے چکے ہیں جو بلند درجات و مراتب کا حامل اور عمر دراز سے موصوف اور سید محمد کے نام سے موسوم ہو گا اور میرے فرجد و شیخ رکن الدین حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی نے اس مراقبہ پر تہنیت لکھی ہے۔

قدس اللہ روحھما

نیز فقیر دوسری بشارتیں بھی رکھتا ہے جن کی ترجمانی کے لیے وقت ساتھ نہیں دے رہا ہے دامنِ مکتوب بھی کفایت نہیں کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ یہ پسر موعود یہی پسر مولود ہو گا۔ واللہ علیٰ کل شئی قدیر اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

حدیثِ شریف میں ہے سافروا تصحوا سفر کرو اور صحت کی نعمت پاؤ۔ نیز دوسری حدیث میں ہے سافروا فان الماء اذا وقف نتن سفر اختیار کرو بے شک پانی جب ایک ہی جگہ ٹھہرا رہے تو بدبودار ہو جاتا ہے۔

صاحبِ مثنوی مولانا جلال الدین رومی حضرت شیخ دقوقی کے احوال میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ ایک منزل میں دوبارہ قیام نہیں کرتے تھے تاکہ دل کو اس جگہ سے کوئی تعلق اور انس پیدا نہ ہو جائے۔

فقیر حجازِ مقدس کے سفر سے واپسی کے بعد ۱۲۶۲ھ سے ۱۲۶۹ھ تک ویلور ہی میں مقیم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ اس کے قلب میں کس قدر ظلمت و کدورت اور تعلق و انس ہو گئے راہ پائی ہو گی۔ اسی خیال سے ۵ رجادی الاول ۱۲۶۹ھ کو ویلور سے رختِ سفر باندھا اور پیارم پیٹ آ موجود

وانم باڑی، ترپاتور، سیلم، ترچناپلی، تنجاوُر ناگور، کارے کال، تردنگاری، شیالی، سلمبر محمود بندر، کلور، تلچری، جنجی، جنگل پیٹ، منرو پیٹ، مدراس، پلیا گھاٹ، کینجی اورآرکاٹ کا دورہ کرتے ہوئے سن مذکور ماہ رمضان کی تیسری تاریخ کو ویلور آ پہنچا۔ الحمد للہ علی ذالک

۱ اسلام کی غربت واجنبیت کے ان ایام میں آسمان سے تباہی وپریشانی کی بے انتہا بارش مسلمانوں پر برس رہی ہے اور لوگوں کی ایک جماعت آپ کی ذات گرامی کو جمعیت وطمانیت کا سبب خیال کررہے ہیں۔ فقیر اس چیز کو اسلام کے لیے غنیمت اور مفید خیال کرتا ہے۔ اور ظہر الغیب سے دعا قبول ہونے کی امید پر خود کو دعا سے فارغ نہیں رکھتا اور آپ کے حق میں دعا کرنا اس جماعت کے حق میں دعا کرنے کے مترادف سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو باقی رکھے اور آپ کے وجود سے اسلام کی شان وآبرو کو باقی رکھے۔

اللہ تعالیٰ سے امید وار ہوں کہ وہ اپنی باقی رہنے والی محبت وجمعیت کی بوباس سے ہماری مشام جان کو معطر فرمائے۔ اور ہم دنیا وما فیہا سے فریب نہیں کھائیں گے جو خدا کی مغضوب اور ملعون ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید تمہارے ساتھ رہے۔ تم جہاں کہیں رہو۔

••

مکتوب بنام ابوالحسن مہاجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد وصلوٰۃ اور تبلیغ سلام سنت کے بعد! قلب سعادت ذخائر پر واضح ہو کہ غلامی صاحب اور اپنے درمیان واقع ہونے والے مقدمہ کے تعلق سے آپ کا التفات نامہ جو اس مسکین کے نام زد تھا عین انتظار میں آ پہنچا اور خیریت وکیفیت سے آگاہ کیا۔ اور قلب کو خوش وخرم کیا الحمد للہ علیٰ ذالک

مکتوب دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ اس مسکین کے تعلق سے ظن نا الضافی کا شکار ہیں۔ حضرت بشر حافی علیہ الرحمۃ سے منقول ہے کہ آدمی کا کمال کی نشانی یہ ہے کہ اس کے دشمن بھی اس سے بے خوف رہیں۔ لیکن یہ کیا کمال ہے کہ آپ کے دوست بھی آپ سے بے خوف نہ رہیں۔ آپ کو اپنے دشمن کی عداوت کے ضمن میں دوستوں کی دوستی اور ان کی سچائی بھی دشمنی اور کبھی

معلوم ہو رہی ہے۔
آپ نے چند امور سے متعلق استفسار کیا تھا۔
غلامی صاحب کی بابت چار سو بارہ روپے اور پاؤ کم آٹھ آنے آپ کے ذمہ تفویض کئے گئے تھے۔ اگر فقیر کے آگے رکھ دیں تو تمہارے استفسار کا جواب تحریر کروں گا ورنہ تضیع اوقات اور تحریر مراسلات کی تکلیف نہ دیں اور طول امید کے رشتے کو کوتاہ گردانیں اور قول و قرار کے مطابق خود کو حکم کے فیصلہ پر راضی کرلیں۔ کیونکہ انصاف مدعی اور مدعی علیہ کے کے خیال پر موقوف نہیں ہے اور جلد از جلد حساب و کتاب کے کاغذات اور دستاویزات وغیرہ کے ساتھ حاضر ہو جائیں یا کسی وکیل کو مختار نامہ کے ساتھ بھیج دیں اور رمضان شریف جو اجر و ثواب کے حاصل کرنے کا مہینہ ہے ایسے مبارک مہینے میں ان امور کی جانب توجہ کرنے سے فقیر کو معذور خیال کریں۔ حق کو باطل قرار دینے میں اور باطل کو حق ثابت کرنے میں کوئی بھی کام انجام دینے سے مانند بید لرزاں و ترساں رہیں۔ اور اپنی گردن پر کسی شخص کا حق باقی نہ رکھیں۔ قبر اور آخرت تمہارے سامنے ہے اور قاضی حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے روبرو حساب و کتاب کا پیش ہونا اور اس کی طرف سے سزا و جزا کا مقرر ہونا امر یقینی ہے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ: جو شخص دنیا میں ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ آخرت میں اس کا ثواب پالے گا اور جو شخص دنیا میں ذرہ برابر بدی کریگا وہ آخرت میں اس کی سزا پالے گا۔

اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ وہ ہمیں اور تمہیں اور سارے دوستوں اور جمیع مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم موت کی یاد اور آخرت کے احوال اپنے پیش نظر رکھیں اور مختصر دنیا کی گرفتاریوں سے فریب نہ کھائیں جو قبر اور آخرت میں کسی طرح کارآمد اور مفید نہیں ہیں۔ اصل کام تو یہی ہے اس کے سوا سب فضول ہے۔ زیادہ کیا تحریر کروں۔ اللہ کی نصرت اور تائید تمہارے ساتھ رہے تم جہاں کہیں رہو۔

مکتوب بنام سعید دارین مکرمی شاہ باقی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
سلام مسنون کے بعد سعادت ذخائر دل پر واضح ہو کہ ۵ ر جمادی الاول ۱۲۸۸ھ کا تحریر کردہ التفات نامہ "ترجمہ رسالۂ مراۃ المحققین" کے ساتھ موصول ہوا۔ خیریت و کیفیت اور درج کردہ مضمون سے آگاہ کیا۔ الحمد للہ علی ذالک آپ نے کتاب کے مطالعہ اور اظہار رائے کی جانب اشارہ کیا تھا لیکن فقیر اکیاسی [۸۱] سال کو پہنچ چکا ہے اور لب گور بیٹھا ہوا ہے اور اس کے علاوہ

ایک انار سو بیمار اور ایک سر ہزار سودا کا حکم رکھتا ہے اور انتہائی قلیل الفرصت ہے۔ علاوہ ازیں رمضان شریف سے پہلے حرمین شریفین پہنچنے کا عزم کیا ہوا ہے تاکہ درِ کعبہ پہ سر جھکا دے اور ارحم الراحمین سے رحمت و مغفرت طلب کرے۔ انہ قریب مجیب بے شک اللہ بندے سے قریب ہے اور دعا سننے والا ہے۔

درالمختار میں امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ النعمان کوفیؒ اپنی عمر کے ستّر سال میں پچپن مرتبہ حج سے مشرف ہو چکے تھے۔ واحسرتا! فقیر اس اکیاسی سال کی عمر میں باوجود دخانی کشتیوں کے اور پوسٹ وغیرہ کے سہولتوں کے اب تک دوسرے حج سے مشرف نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حدیثِ نبویؐ میں وارد ہے سافروا فان الماء ذا وقف فتن۔ سفر اختیار کرو بے شک پانی جب ایک ہی جگہ ٹھہرا رہے تو وہ خراب ہو جاتا ہے اور فقیر سالہا سال سے ایک ہی جگہ پر مقیم ہے۔ اس کے قلب میں کس قدر ظلمت و کدورت اور حجاب نے بسیرا کیا ہوگا۔ ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا انک علی کل شیٔ قدیر: اے پروردگار ہمارے لیے ہمارے اس نور کو اخیر تک رکھ اور ہماری مغفرت فرما۔ تو ہر شئے پر قادر ہے۔

حاصلِ کلام! ان دنوں حرمینِ شریفین کی روانگی کے قصد کے باعث فقیر کی ہمت اور ارادہ قطع تعلقات میں مصروف ہے۔ اس کی وجہ سے خاطر خواہ مطالعہ سے قاصر رہا۔ بہرحال آپ کے حسب ایما سرسری نظر دیکھ لیا ہوں اور قلب میں جو کچھ القا ہوا ہے سپردِ قلم کیا ہوں۔ لیکن آپ بھی فقیر کی تحریر کا غور و خوض سے جائزہ لیں اور ان میں جو پسند آئے اس کو بحال رکھیں۔ دل میں بہت سی باتیں ہیں لیکن قلم ان کی ترجمانی سے عاجز ہے۔ ے

عمر بگذشت و حدیث درد من آخر نہ شد
شب بآخر شد اکنون کوتہ کنم افسانہ را

عمر گزر چکی لیکن میری درد بھری داستان ختم نہ ہو سکی۔ رات ختم ہو رہی ہے لہٰذا میں افسانہ کو مختصر کئے دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہم تمام مسلمانوں کو شریعتِ مطہرہ پر استقامت عطا فرمائے گا اور دنیا و مافیہا سے جو کہ زوال پذیر ہے اور خدا کی ملعون ہے فریب نہ دے گا۔

فقیر آپ کی شخصیت اور وجود کو غنیمتِ وقت جانتا ہے اور خلوص دل کے ساتھ دعا میں مشغول رہتا ہے۔ اللہ تمہیں باقی رکھے۔ اور تمہاری بقاء سے اسلام کو بقاء عطا فرمائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر چند کہ رسالہ "مرأۃ المحققین" بہت اچھی کتاب ہے اور کثیر فوائد کی حامل ہے لیکن اس کے بعض مقامات میں فلسفہ کے مباحث بھی درج کئے گئے ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ شروح جام جہاں نما، لوائح، لمعات، لمعات

رباعیات، شرح رباعیات، تعرف، عوارف، ذوارف، فصوص الحکم، شرح فصوص نصوص، نقد النصوص، ترجمہ عوارف، شرح گلشن راز کا مطالعہ کریں اوران بزرگانِ کرام کے کلام کے لیے کسوٹی شریعت قرار دیں تاکہ حجاب اٹھ جائے اور حق منکشف ہوجائے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع محسنین۔

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو قرب و ثواب کے راستے ضرور دکھائیں گے۔

مکتوب بنام محمد بدرالدین حسین صاحب حیدرآباد

بعد سلام مسنون کے قلب سعادت ذخائر پر واضح ہو کہ مورخہ ۲۲ رجب ۱۲۸۸ھ کا مکتوب دستیاب ہوا اور تحریر کردہ مضامین اور نوید خیریت سے مطلع کیا الحمد للہ علیٰ ذالک۔

آپ نے اپنی برخودار فاطمۃ النساء بیگم کی نسبت سے متعلق استفسار کیا تھا۔

سعادت آثار!

مکرمی مولوی محمد مہدی صاحب واصف کے فضائل و کمالات واضح ہیں کہ انھوں نے دین متین کی تقویت و سربلندی میں ایک عمر صرف کردی ہے بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تفسیر جلالین اور کیمیائے سعادت کے مترجم ہیں۔ اس کے علاوہ فقیر کے ساتھ روحانی قرابت اور قلبی محبت والفت رکھتے ہیں۔ ان کے خلف الصدق سعید دوجہاں مولوی عبدالباسط صاحب بھی مختلف فضائل و کمالات کے حامل ہیں اور صاحب علم و فن ہیں اور اس کے ساتھ خوش رو خوش خو اور صاحب معاش ہیں۔ لیکن سنا گیا ہے کہ آمد سے زیادہ خرچ رکھتے ہیں۔ اور صاحب اہل و عیال ہیں۔ اور برخورداروں کے عزیز اور نازپروردہ ہیں۔ اگر آپ کو ان امور سے اطمینان حاصل ہو جائے اور رنج کا احتمال نہ رہے تو فقیر کی نظر میں اس نسبت کے لئے اقدام مناسب ہے۔

اللہ تعالیٰ تمہیں اور تمہارے کاموں میں خیر و برکت عطا فرمائے اور اسی سے عافیت وسلامتی طلب کی جائے۔

مکتوب بنام نواب محمد داؤد خان بہادر کرنول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام مسنون کے بعد خاطر سعادت ذخائر پر واضح ہو کہ ۲۲ر جمادی الاول ۱۲۸۸ھ کا تحریر کردہ مکتوب گرامی بذریعہ رجسٹری موصول ہوا اور فقیر اس کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔

الحمدللہ والمنہ سبحان اللہ کہ آپ کو فقر محمدی کی میراث ہاتھ آئی ہوئی ہے، جو فقراء کے ساتھ محبت والفت اور ان کے ساتھ ارتباط کا ثمرہ ہے۔ بہت کم اشخاص ایسے ہیں جو کامرانی اور جوانی کے عالم میں حق کی طرف مائل رہتے ہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم کا مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ بحرمت سید البشر آپ والا مرتبت کو ہمیشہ اپنے ساتھ اور حفظ وامان اور قرب میں رکھے اور اپنے غیر کے ساتھ نہ رکھے۔

آپ نے متعدد مکتوبات ارسال کرنے کی بات کہی ہے۔ مخدوم من! فقیر ۲۰ر صفر ۱۲۸۸ھ کے تحریر کردہ مکتوب کے علاوہ کسی اور خط سے مشرف نہ ہو سکا۔ مذکورہ خط بھی جواب طلب نہ تھا فقر اس کے وصول ہونے سے آگاہ کیا اس کے جواب دینے کی تکلیف اور تکلف سے باز رہا ورنہ جواب ارسال کرنے سے قاصر نہیں رہا۔ اور یہ مسکین اکیاسی سال کی سرحد پر پہنچ چکا ہے اور لب گور بیٹھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک انار سو بیمار اور ایک سر ہزار سودا کے مصداق ہے۔ لہذا کسی کوتاہی اور قصور کو چشم پوشی اور اعراض پر محمول نہ کریں۔ اور اس کو اپنوں سے علاحدہ اور فراموش خیال نہ کریں المرء مع من احبہ۔ آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کو محبت ہو جاتی ہے متفق علیہ حدیث ہے اللہ کی نصرت اور تائید تمہارے ساتھ رہے اور تمہاری بقا سے اسلام کو بقا ← اور دوام نصیب ہو۔

مکتوب بنام مولوی بدرالدولہ بہادر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ کتاب "جواہر الحقائق" خدمتِ شریف میں ارسال ہے تاکہ آپ قبول فرمائیں اور اس کا ایک جائزہ لیں اور فقیر دعائے ظہر الغیب سے مشرف ہو جائے۔

اسلام کی اجنبیت اور غربت کے ان ایام

ہیں آپ کی ذات گرامی مسلمانوں کے لیے غنیمت ہے اللہ تعالیٰ بحرمت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو باقی رکھے اور آپ میں اور آپ کے ہر کام میں برکت عطا فرمائے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: علامۃ اعراضۃ تعالیٰ عن العبد اشتغالہ بما لا یعنیہ۔ بے فائدہ اور لایعنی کاموں میں بندہ کا مشغول ہوجانا یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ نے اس سے منہ پھیر لیا ہے۔ ؎

ہرچہ جز عشق خدا بے احسن است　　گر شکر خوردن بود جان کندن است

عشق خداوندی کے سوا ہر چیز بری اور قبیح ہے۔ اگر لذت حاصل کرنا ہے تو جان کو مشقت میں ڈالنا ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ماسوا سے دور رکھے اور اپنی جناب قدس میں قسمتِ نیک کا مالک بنائے اور اللہ ہر شئے پہ قادر ہے۔

مکتوب بنام محمد ابراہیم موڈھدار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

حمد و صلوٰۃ اور دعاؤں کے ارسال کے بعد واضح ہو کہ آپ کا پروانۂ محبت اسلوب' کتاب نصیحت المسلمین' کے ساتھ آپہنچا جس کے ذریعہ وہاں کے لوگوں کی نااتفاقی اور فتنہ و فساد کے بارے میں اور نصیحت المسلمین کے مضامین کی صحت اور عدم صحت کے استفسار اور مصنف کتاب مولوی خورم علی کو وہاں کے بعض لوگ رافضی اور مشرک کہہ رہے ہیں علم ہوا اور حامل مکتوب کی زبانی بھی وہاں کے حالات معلوم ہوئے۔

مذکورہ کتاب کو ابتدا سے لے کر آخر تک مطالعہ کرچکا ہوں اور مطالعہ کے ابتدا ہی میں سمجھ لیا کہ اس کا مصنف نیک دل ہے اور اہل سنّت وجماعت کے صحیح ودرست اعتقاد پر بہت زیادہ ثابت اور قائم ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ کتاب مذکور شرک و بدعت کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے بہت خوب اور مضبوط و مستحکم ہے اور اپنے نام کی طرح مومنوں اور مسلمانوں کے لیے پند و نصیحت ہے۔

عوام الناس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قیل وقال اور بحث و مباحثہ کے خیال سے بھی دور رہیں اور

کسب و معاش کو بہتر بنانے اور آخرت کو سنوارنے اور نماز و روزہ ادا کرنے میں مشغول اور منہمک رہیں۔ اور شرک و بدعات سے اجتناب کرتے رہیں۔ ذرہ برابر شرک و بدعت میں ظلمت و کدورت کے سوا دوسری چیز محسوس نہیں کرتا ہے۔ اگر بالفرض مشرک و مبتدع کے عمل کو آج کے روز ضعف بصارت کی وجہ سے تر و تازگی اور فائدہ کی نظر سے دیکھیں تو کل کے روز جب کہ قوت بصارت میسر ہوگی تو جان لیں گے کہ نقصان اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہے۔ ؎

بوقت صبح شود روز معلومت ... کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

دن کی حقیقت تجھ پہ صبح روشن ہونے کے بعد ہی معلوم ہوگی کیوں کہ عشق کا مارا ہوا شب تاریک ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔

مدراس میں دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ خورم علی اور نثار علی اور قدرت علی کے نام سے موسوم اور مذہب اہل سنت میں مشہور و معروف ہیں۔ لہذا مومن کے لیے زیب نہیں کہ محض کسی شخص کا نام خورم علی سن لیں تو مسمّٰی کے رافضی اور شیعی ہونے کا برا گمان کر بیٹھتے ہیں اِنّ بعض الظن اثم بلا شبہ بعض گمان گناہ ہیں۔

خواجہ بادشاہ ذی عقل آدمی، عالی خاندان اور ان شہروں کے مشاہیر میں سے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ایسے بے مزہ اور شک و شبہ کے دستاویز ایک عالم کے لیے فتنہ و فساد کا مصدر نہیں ہوں گے۔ شاید دونوں جماعتوں کے خدمت گاروں کے سبب یہ بات پیدا ہوئی ہوگی۔ آں محب و مکرم! ایسے بزرگوں اور ان کے فرماں برداروں کو ایذا اور تکلیف پہنچانے کے درپے نہ ہو جائیں۔ اور یہ مکتوب ملفوف ان کی خدمت میں پہنچا دیں اور اللہ تعالیٰ سے امید قوی رکھتا ہوں کہ اس بزرگ کے ذریعہ فتنہ ختم ہو جائے گا اور فساد صلاح کی شکل میں بدل جائے گا۔ انہ علیٰ کل شیئ قدیر۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے۔

نقوشِ طاہر

حضرت مولانا مولوی ابوالحسن صدرالدین سید شاہ محمد طاہر قادری رح
سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ ویلور

ذیل کا یہ مضمون حضرت مولانا صدرالدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمۃ، سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ کی نوکِ قلم سے نکلا تھا۔ جو پچیس سال پہلے کے 'اللطیف سنہ 1965ء میں شائع ہوا۔ یہ دُرِّ نایاب قارئینِ کرام کی نذر ہے۔ ادارہ:

ہزاروں درود و ہزاروں سلام
بحقِ محمدؐ علیہ السلام

تمام حمد و ثنا اس ذاتِ واحد اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہے جس نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کیا اور ان تمام کا رزاق بنا۔ درود و سلام ان تمام پیغمبروں پر جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً دنیا میں روانہ فرمایا۔ اس لیے اپنے فضل سے عالم میں ایسی ایسی پوشیدہ اور ظاہر، نایاب و نادر ہستیوں کو پیدا کیا، جنھوں نے خالقِ کائنات پر یقینِ کامل اور یقینِ محکم رکھتے ہوئے کبھی سر مو احکاماتِ الٰہی کے خلاف ورزی نہ کی۔

ناموران اسلام تو اس دنیا میں اپنے زندۂ جاوید کارنامے چھوڑ گئے۔ لیکن ایسی بہت ساری ہستیاں بھی ہیں جن کے زرّین کارنامے رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بن کر افقِ عالم پر چمکتے رہیں گے۔ چند عدیم المثال کارناموں کو منظر عام پر لانے کی سعی بلیغ کی گئی ہے۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں جب کہ اسلامی فتوحات کا دور دورہ تھا، اسلامی تاریخ کے ایک زرّین باب میں تحریر ہے کہ خلیفۂ دوّم حضرت عمر فاروق نے اپنے خط کے ساتھ ایک خصوصی نمائندہ کو سپہ سالارِ روم کے پاس بھیجا۔ جب ان کی آمد

کی سپہ سالارِ روم نے سنی تو اس نے اپنے تمام افسروں کو خیمہ میں طلب کیا اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ خلیفۂ اسلام کے پیامبر کو ذلّت پہنچانے کی غرض سے ایک نشست بھی خالی نہیں چھوڑی۔ بعد ازاں انھیں خیمہ کے اندر آنے کی اجازت دی گئی۔ وہ اپنے گھوڑے سے اتر کر اندر داخل ہوئے اور خلیفۂ وقت کا خط انھوں نے سپہ سالار کو پہنچا دیا۔ چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہیں بھی خالی نشست نہیں پائی تو فوراً ہی میان سے تلوار نکال کر جہاں کھڑے تھے بیچ قالین میں شگاف ڈالا اس کا چوکونہ ٹکڑا پھینک کر وہیں بیٹھ گئے۔

سپہ سالار نے للکار کر کہا یہ کیا حرکت اور گستاخی ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا: کہ میرے یہاں بیٹھنے سے میری ذلّت نہیں ہوگی۔ عزّت اور ذلّت کا دینے والا اللہ ہے۔ کسی اور نے غضب میں آکر کہا کہ اس تلوار سے تمہاری گردن اڑا دی جائے گی۔ اطمینان سے انھوں نے اپنی تلوار ان کے سامنے پھینک کر کہا کہ اگر تم مارنا چاہو گے تو نہیں مار سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ اس عالی ہمتی اور بے باکی اور اپنے آپ پر پورا اعتماد اور اللہ پر کامل یقین دیکھ کر وہ تمام عیسائی اسلام کی خوبیوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور اپنی حرکت پر شرمندہ و نادم ہوئے۔

تاریخ اسلام کے ایک اور سنہرے باب میں درج ہے کہ صلیبی جنگ کے موقع پر صلاح الدین اور رچرڈ کی فوجوں میں جنگ و جدل ہو رہی تھی۔ آخر ایک وقت جب کہ اسلامی سپاہی گرفتار ہو گئے تو عیسائی فوجوں کے سپہ سالار نے حکم نافذ کیا کہ گرفتار شدہ فوجیوں کی ایک قطار کھڑی کر دی جائے اور ان میں سے ہر دوسرے سپاہی کو قتل کر دیا جائے۔ بہ تعمیلِ حکم ہر دوسرے سپاہی کا قتل ہوتا گیا۔ جب ایک آدمی کے پاس پہنچے تو سپہ سالار نے اُن کو پہچان لیا کہ اس نے ایک مرتبہ شدتِ پیاس کے موقع پر موصوف کو پانی پلایا تھا۔ احسان کا تقاضا تھا کہ وہ بھی ایسے موقع پر رحم و سلوک کا برتاؤ کرے۔ لہٰذا اس نے دریافت کیا کہ تیری آخری خواہش کیا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ میں اپنی بوڑھی ماں سے مل کر دودھ بخشوانا چاہتا ہوں اور وہ بھی میرے انتظار میں سخت پریشان رہے گی۔ سپہ سالار نے پوچھا کہ ایک مرتبہ چھوٹ جانے کے بعد پھر دوبارہ کیسے واپس آئے گا؟ کہا کہ مسلمان کا وعدہ سچّا ہوتا ہے۔ اور جب دو فریقین کے درمیان عہد و پیمان ہوتا ہے تو تیسرا بھی ایک ہوتا ہے جو اللہ کی ذات ہے۔ یہ عہد و پیمان اسی کے سامنے ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس کا چچا بھی تھا۔ جو اس کے بازو ہی تھا اور اس نے بھی اس کی ضمانت دے دی۔

لہٰذا اس کو چند دن کی مہلت دے دی گئی وہ اپنی والدہ سے جا ملا جو اس کی یاد میں بیمار ہو چکی تھی

جب اس کی آمد کی مدّت ختم ہو گئی اور وہ نہ آیا تو اس کے چچا سے کہا گیا وہ نہیں آیا۔ اب تمہاری قتل کی باری ہے۔ چچا نے کہا کہ وہ ضرور آئے گا۔ لہٰذا مزید چوبیس گھنٹے کا وقت دیا گیا۔ لوگوں نے اپنے مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ کسی نے کہا کہ تم نے یہ ضمانت دے کر بے وقوفی کی اور کسی نے کہا کہ جب ایک چڑیا ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو کہیں اس کے واپس آنے کی امید کی جاتی ہے۔ جب ایک شیر اپنے پنجرے سے باہر ہو جاتا ہے تو کیا وہ دوبارہ واپس آتا ہے۔ تم نے اپنی حماقت سے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں پریشان کن باتیں ہوتی رہیں۔ ان تمام کا جواب اس نے صرف اتنا ہی دیا کہ وہ ضرور آئے گا۔ اسی اثنا میں مزید مدّت بھی ختم ہو گئی۔ شدید انتظار کے باوجود نہیں آیا۔ لہٰذا مایوسی کے عالم میں بھتیجے کی جگہ چچا کو مقتل میں کھڑا کیا گیا۔ اور قتل کا حکم دیا گیا عین اسی وقت تیز رفتاری سے گھوڑے سے آکر اترا اور اپنے چچا کو ہٹا کر آپ کھڑا ہو گیا۔ اور کہا کہ اب قتل کرو۔

اس منظر کو دیکھ کر تمام لوگ حیران رہ گئے دریافت کیا گیا کہ تیری آمد میں یہ دیر کیوں ہوئی جواب میں کہا کہ اس کی ماں اس کے انتظار میں بیمار ہو گئی تھی اس کا علاج کراتے میں تاخیر ہوئی۔ اس سے مزید پوچھا گیا کہ کیا تجھے موت کا ڈر نہیں۔ کہا کہ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ اور مسلمان کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔

اسلام کی حقانیت اور صداقت سے متاثر ہو کر بہت سے عیسائی مشرّف بہ اسلام ہو گئے۔

سلاطینِ عثمانیہ میں سلطان سلیم خان بڑا جلال و ہیبت والا بادشاہ گزرا ہے۔ ایک روز اس کو ملازمینِ خزانہ پر غصہ آگیا اور ان میں سے ڈیڑھ سو آدمیوں کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ مولانا علاؤالدین جمالی اُن دنوں مفتیٔ اعظم کے عہدے پر مامور تھے۔ جب انھوں نے یہ سخت حکم سنا تو ان کو ملازموں پر رحم آیا اور سلطان کے قہر و غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بابِ عالی پر تشریف لے گئے۔ آپ کی اچانک آمد پر لوگ حیران رہ گئے۔ حضورِ سلطانی میں جب اُن کی آمد کی اطلاع ہوئی تو یہ اجازت ملی کہ تنہا آئیں۔ یہ وہاں پہنچے اور سلام کرکے بیٹھ گئے اور سلسلۂ تقریر یوں شروع کیا۔ جو علماء منصبِ افتاء رکھتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ سلطانِ وقت کی آخرت بھی درست کرنے کی فکر رکھیں۔

میں نے سنا ہے کہ سلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیا ہے۔ حالاں کہ شرعاً یہ تجویز ناجائز ہے۔ لہٰذا میں عفو سلطانی کی استدعا کرتا ہوں۔

سلطان کو اپنے مفتی کی یہ مداخلت نہایت ناگوار معلوم ہوئی اور قہر آلود ہو کر کہا کہ تم کو امور سلطنت میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ انہوں نے کہا

کہ ہیں معاملاتِ سلطنت میں دخل نہیں دینا چاہتا بلکہ عاقبتِ سلطانی کی عافیت چاہتا ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ "ان عفوت فلک النجاۃ والا فلک عقاب عظیم" یعنی اگر تم معاف کردو گے تو نجات پاؤ گے ورنہ سخت عذاب میں مبتلا ہو گے۔ سلطان کے دل پر اس کلام کی جلالت اثر کر گئی اور غصّہ فرو ہو گیا۔ اور ان تمام ملازموں کی خطائیں معاف کر دی۔ جب مفتی ممدوح نے اٹھنے کا قصد کیا تو فرمایا کہ میں سلطان کی آخرت کے متعلق تو فرضِ منصبی ادا کر چکا، اب ایک بات شانِ سلطنت کی نسبت کہنا چاہتا ہوں۔ سلطان نے پوچھا وہ کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ سب بے چارے آپ کے غلام ہیں۔ کیا یہ مناسب ہو گا کہ غلامِ شاہی ہو کر دربدر مانگتے پھریں۔ ! سلطان نے فرمایا کہ نہیں انہوں نے کہا تو ان کی جگہ پھر انھیں کو عطا فرمائی جائے۔ سلطان نے ازراہِ مراحمِ خسروانہ اس کو بھی قبول کیا۔ مگر یہ کہا کہ ان کو قصور کی سزا ضرور دی جائے گی۔ مولانا نے کہا اس میں مجھ کو کچھ کلام نہیں ہے۔ کیوں کہ تعزیر مرضیٔ سلطانی پر منحصر ہے۔

حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کا مکان شہر بصرہ میں لب سڑک تھا۔ ایک روز آپ غسل کرنے کے ارادے سے غسل خانہ گئے۔ تو آپ اپنا پوستین سڑک کے کنارے ہی چھوڑ گئے اتفاق سے حضرت خواجہ حسن رح بصری کا گزر وہاں سے ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کا پوستین چھوٹ گیا ہے۔ لہٰذا تھوڑی دیر تک آپ وہیں نگرانی کرتے رہے۔ اس اثنا میں حضرت موصوف غسل سے واپس آئے تو دیکھا کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ آپ کی پوستین کی نگرانی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ خواجہ صاحب کو سلام کیا اور فرمایا کہ اے مسلمانوں کے امام آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم نہیں جانتے کہ پوستین یہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ اگر کوئی لے جاتا تو کیا ہوتا؟ تم کس کے بھروسہ پر چھوڑ گئے تھے؟ حضرت حبیب نے فرمایا کہ میں اس کے بھروسہ پر چھوڑ گیا تھا جس نے آپ جیسے ایمان دار اور دیانت دار اور صاحب کمال کو اس کا نگہبان بنایا۔

زمانۂ سلف کے عظیم انسانوں کا یہ شاندار کردار ہے! دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو یہ اعلیٰ کردار عطا کرے اور اسلام کی تمام ترخوبیوں سے انھیں مالا مال کرے۔ آمین۔ ثم آمین۔! ●●

قلب المومن عرش اللہ

حضرت مکان مولانا مولوی سید شاہ عثمان صاحب قادری عرف فصیح پاشاہ ایم اے ناظم دار العلوم لطیفیہ ویلور۔

اللہ تبارک تعالیٰ کی اس قائم کردہ دنیا میں ہزاروں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور ہزاروں لوگ مرتے ہیں۔ پیدا ہوتے وقت سب لوگ معصوم اور گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ لیکن اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت سب کی کیفیت یکساں نہیں ہوتی۔ ہر ایک کا مرتبہ اس کے اعمال کے اعتبار سے ہوگا۔ میری مراد عمل بالاخلاص سے ہے۔ دنیا میں جس نے جیسا عمل کیا ہوگا، اس کی نیت کے مطابق اس کا اجر اُسے آنے والی دنیا میں ملے گا۔ جب تک کوئی دنیا میں رہتا ہے اُس کے اعمال کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کے اعضاء جوارح سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا اس کے قلب سے۔ اور جو عمل اس کے اعضاء جوارح سے ہوتا ہے اس کو اسلام کہتے ہیں اور جو عمل اُس کے قلب اور نیت سے ہوتا ہے اس کو ایمان کہتے ہیں۔

اصل دنیا تو دل کی دنیا ہے۔

ایک حدیث ہے: ان اللہ لا ینظر الی صورتکم ولا الی اعمالکم ولکن ینظر الی قلبکم ونیاتکم۔ اس حدیث کا ترجمہ مولانا روم نے اس طرح کیا ہے۔ ؎

ما درون را بنگریم وحال را
ما بروں را ننگریم وقال را

یعنی اللہ تمہاری ظاہری صورت اور ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا وہ تو تمہاری نیّت اور تمہارے دل کی حالت کو دیکھتا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عملی طور پر اسلامی اصولوں پر جیتے ہیں لیکن ان کا قلب پورے

طور سے ان اصولوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ جن کو ہم منافقین کے نام سے جانتے ہیں۔

ابتدائے اسلام سے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ظاہری طور سے تو اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہیں اور جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو بدل جاتے ہیں یا بہانے بناتے ہیں اس دنیا میں تو وہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں لیکن آنے والی دنیا میں ان کا انجام بہت خوفناک اور دردناک بتایا گیا ہے۔

قرآنِ شریف میں کئی ایک جگہ اللہ تبارک تعالیٰ یہ بات بتاتے ہیں کہ ہم جس کو راہِ ہدایت نہیں دیتے ان کے دل کو روشن نہیں کرتے، اگر کوئی کتنا بھی ان کو ہدایت کرے وہ راہ راست پہ آنے والے نہیں ہیں۔ اور جس کو راہ ہدایت پہ لاتے ہیں اُن سے قرآن یہ فرماتا ہے کہ اللہ کا ذکر کرو اور اللہ کا ذکر کرنے سے تمہارے دل طاقت ور ہوں گے۔

اس لیے ہم کو چاہیے کہ جو عمل ہو اس کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اخلاص کے ساتھ کریں۔

قلب کیا ہے؟ یہ تجلّی گاہِ ربّانی ہے

یہ وہ تجلّی ہے کہ جس کا متحمل صرف مومن کا قلب ہو سکتا ہے اور ایمان کا تعلق دل سے ہے۔

دل منوّر ہو تو زندگی کامیاب ہے۔ اگر نسان زندہ ہے لیکن اس کا دل سیاہ ہے تو مردہ کے برابر ہے، لیکن اگر انسان کا دل روشن ہے اور اگر وہ مزار میں ہے پھر بھی زندہ ہے۔ قرآن شریف میں چلتے پھرتے کافروں کو مردہ کہا گیا ہے۔ انہیں گونگا اور بہرہ کہا گیا ہے لیکن اللہ کی راہ میں شہید ہو کر مرنے والے کو کہا گیا ہے کہ انھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں انھیں اپنے رب کے پاس سے رزق بھی دیا جاتا ہے۔ یعنی اصلی مردہ وہ ہیں جن کے دل مردہ ہیں۔ اور جن کے دل زندہ ہیں انھیں ہمیشہ کی زندگی ملتی ہے۔

دلوں کی اصلاح کرو جب وہ ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابنِ آدم کے اندر ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا کارخانۂ جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا کارخانۂ جسم بگڑ جاتا ہے۔ یہ لوتھڑا وہی دل ہے۔

دل کی اصلاح تقویٰ اور اللہ تعالیٰ پہ توکّل سے ہوتی ہے۔ اور توکّل کے لیے توحید پہ ثابت قدم رہنا اور اعمال میں اخلاص پیدا کرنا ضروری ہے۔

دل بگڑتا کیسے ہے؟

صفاتِ حسنہ کے فقدان سے بگڑتا ہے دل ایک پنجرہ ہے جو اس کے جسد کے پنجرہ میں قید ہے جیسے کوئی موتی صدف میں قید رہتا ہے۔ یا دولت

خزانے میں بند رہتی ہے۔ لحاظ پرندکا ہونا چاہیے نہ کہ قفس کا، لحاظ موتی کا ہونا چاہیے نہ صدف کا دولت کا ہونا چاہیے نہ کہ سنگ وخشت کا۔

دل کی زندگی کچھ اور ہی ہے۔

ایک وقت جب غوث الاعظمؒ خطبہ دے رہے تھے تو ایک صاحب آئے اور حضرت کو اطلاع دی کہ آپ کا مال بردار جہاز ڈوب گیا ہے۔ آپ نے اپنے قلب کی جانب دیکھا اور فرمایا الحمدللہ۔ چند ہی لمحے بعد ایک اور صاحب آئے اور کہا کہ جہاز خیریت سے لنگر انداز ہوا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا الحمدللہ۔ جو حضرات اس وقت موجود تھے انھوں نے دریافت فرمایا کہ آپ نے ہر دو مرتبہ الحمدللہ فرمایا۔ اس پر غوث الاعظم نے فرمایا: جب جہاز کے ڈوبنے کی اطلاع ملی میں نے دل کی طرف دیکھا کہ مال کے گم ہوجانے سے دل پر کوئی اثر ہوا ہے؟ لیکن کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس لیے میں نے کہا الحمدللہ۔ پھر میں نے مال کے ملنے کی خبر پر دیکھا کہ دل میں کسی قسم کی خوشی و مسرت ہے، لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہیں تو میں نے کہا الحمدللہ۔ اس واقعہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ دل کی کیفیت ہی اصل کیفیت ہے۔

اخلاقِ محمدیؐ میں یہ واقعہ نقل ہے کہ لقمان حکیم سے جب کہا گیا کہ بکرے میں کون سی چیز بہتر ہے تو حکیم نے دِل دکھایا۔ پھر جب سب سے بری چیز پوچھی گئی تب بھی دِل ہی دکھایا اور جواباً کہا کہ یہی اصل ہے۔ یہ اچھا یعنی دل اچھا تو سب اچھا اور دل خراب تو سب خراب۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں: ؂

دِل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کرو دوبارہ

مکاشفۃ القلوب میں ایک واقعہ درج ہے۔ جس سے ہم کو عشق کی اہمیت اور دل میں اللہ کی محبت رکھنے والوں کا حال معلوم ہوگا۔

حکایت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک جوان کے قریب سے گزرے جو باغ کو پانی دے رہا تھا اس نے کہا اللہ سے دُعا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے ایک ذرّہ اپنے عشق کا عطا کر دے۔ آپؑ نے فرمایا: ایک ذرّہ بہت بڑی چیز ہے، تم اس کے تحمل کی استطاعت نہیں رکھتے۔ کہنے لگا: اچھا آدھا ذرّے کا سوال کیجیے!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ربِّ تعالیٰ سے سوال کیا: اے اللہ اسے آدھا ذرّہ اپنے عشق کا عطا فرما دے۔ اس کے حق میں دعا فرما کر آپؑ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

کافی مدّت کے بعد آپؑ پھر اسی راستے سے گزرے اور اس جوان کے متعلق سوال کیا۔ لوگوں نے کہا وہ تو دیوانہ ہوگیا ہے اور کہیں پہاڑوں کی طرف نکل گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ربّ سے

دعا کی: اے اللہ! میری اس جوان سے ملاقات کرا دے۔ پس آپؑ نے دیکھا وہ ایک چٹان پہ کھڑا ہے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آپؑ نے اُسے سلام کیا، مگر وہ خاموش رہا۔ آپؑ نے کہا: مجھے نہیں جانتے؟ میں عیسیٰؑ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرف وحی کی:

اے عیسیٰؑ! جس کے دل میں میری محبّت کا آدھا ذرّہ موجود ہو وہ انسانوں کی بات کیسے سُن سکے گا۔ مجھے اپنی عزّت اور جلال کی قسم! اگر اسے آرے سے دو ٹکڑے بھی کر دیا جائے تو اس کو محسوس نہ ہوگا۔

جو شخص تین باتوں کا دعویٰ کرتا ہے اور خود کو ان تین چیزوں سے پاک نہیں رکھتا تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔

۱۔ جو شخص ذکرِ خدا کی حلاوت پانے کا دعویٰ کرتا ہے مگر دنیا سے بھی محبت رکھتا ہے۔

۲۔ جو اپنے اعمال میں اخلاص کا دعویٰ کرتا ہے مگر لوگوں سے اپنی عزت افزائی کا خواہش مند ہے۔

۳۔ جو اپنے خالق کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے مگر اپنے نفس کو ذلیل نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ
ہم سب کو
قلب المومن عرش اللہ
کا مصداق بنا دے۔۔!
آمین بجاہِ
سید المرسلینؐ !!

دوسری اور آخری قسط

مولانا مولوی حکیم سید افسر باشاہ صاحب افسر، شفا ڈسپنسری، گرم پاتم ۶۰۲ ۶۳۲

روائ حدیث محمد بن اسحاق پر جرح

ابوداؤد کی اس حدیث میں جس کے راوی حضرت سائب بن یزید ہیں، ان کے شاگرد زہری ہیں اور ان کے شاگرد محمد بن اسحاق ہیں اور یہ محمد بن اسحاق ائمۂ محدثین کے کبار ناقدین کے نزدیک مجروح ہیں۔ چناں چہ کتاب الضعفاء میں[1] امام نسائیؒ نے انھیں اس طرح فرمایا ہے "محمد بن اسحق لیس بالقوی"(۲)، 'تذکرة الحفاظ' میں علامہ ذہبیؒ نے لیس بحجة سے (۳) تقریب التہذیب میں حافظ ابن حجرؒ نے تدلیس سے (۴) تہذیب الکمال میں امام ابوزرعہؒ نے منکر الحدیث سے (۵) میزان الاعتدال میں امام دارقطنیؒ نے لا یحتج بہ سے یاد کیا ہے۔ (۶) اور خود امام ابوداؤد سے 'میزان الاعتدال' میں محمد بن اسحق پر 'قدری' اور 'معتزلی' والے الفاظ جرح نقل ہوئے ہیں۔

(۷) اور اسی طرح سلیمان تیمیؒ (۸) اور ہشام ابن عروہؒ نے انہیں "کذاب" کا خطاب دیا ہے۔

(میزان الاعتدال)

(۹) اسی کتاب 'میزان الاعتدال' میں امام دار الہجرة حضرت امام مالکؒ سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے محمد بن اسحق کو دجّال من الدجاجلة کہا ہے۔ اور اس طرح ناقدین وجارحین کی فہرست میں جہاں (۱۰) سفیان ابن عیینہؒ، (۱۱) حماد بن سلمہؒ، (۱۲) حمید بن حبیبؒ، (۱۳) امام احمد بن حنبلؒ، (۱۴) اور صاحب المسند ابن عدیؒ بھی ہیں، وہیں (۱۵) مکی بن ابراہیمؒ (۱۶) اور امام الجرح والتعدیل علی بن المدینیؒ بھی ہیں۔ دیہ دونوں امام بخاریؒ کے استاد ہیں۔) ان کی جرح کے الفاظ اس طرح ہیں:-

"قال علی یحدث عن المجھولین باحادیث باطلة" (علی بن المدینی کہتے ہیں کہ محمد بن اسحق ایسے لوگوں سے جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں جو

مجہول اور نا معلوم ہیں۔ (۱۷) نیز کتاب الضعفاء لابن الجوزیؒ میں امام بخاریؒ کے دادا استاد امام الجرح والتعدیل حضرت یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں "قال یحیی بن سعید القطان ماترکت حدیثہ الا للہ اشھد انہ کذاب" (کتاب الضعفاء لابن الجوزیؒ) یعنی یحییٰ بن سعید القطانؒ کہتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق کی حدیث کو میں نے محض لوجہ اللہ ترک کر دیا ہے اور میں اس بات کی گواہی بھی دیتا ہوں کہ وہ بہت جھوٹے ہیں۔

ابھی آپ نے کبار ناقدین اور عظیم جارحین کی ایک طویل فہرست دیکھ لی جو سترہ ۱۷ حضرات پر مشتمل تھی۔ ان کے علاوہ بعض نقادین نے جہاں محمد بن اسحاق پر سخت تنقید کی ہے وہیں دو ایک نام ایسے بھی مل رہے ہیں جنھوں نے آپ کی تعدیل و توثیق بھی کی ہے۔(۱۸) اور پھر اس پر صاحب کتاب "میزان الاعتدال" نے ایک لطیف اور عمدہ پیرایہ پر بحث کی ہے۔ اور آخر میں ایک اٹل اور لم یزل فیصلہ سناتے ہوئے اس طرح اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ:-

فالذی یظھرلی ان ابن اسحٰق حسن الحدیث، صالح الحال صدوق وما انفرد بہ ففیہ نکارۃ فان فی حفظہ شیئاً" (میزان الاعتدال) یعنی تمام اقوال کی جرح و تعدیل، تحقیق و تنقید کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ابن اسحٰق حسن الحدیث، نیک بخت اور سچے آدمی ہیں۔ لیکن جس روایت میں وہ منفرد اور تنہا ہوں اس میں نکارت ہوتی ہے (لہٰذا وہ روایت منکر ہوئی) کیوں کہ ان کے حافظہ میں نقصان ہے۔

(۱۹) علامہ ذہبیؒ نے اپنی کتاب "تذکرۃ الحفاظ" میں محمد بن اسحٰق کی نسبت ائمۂ حدیث کی جرح و تعدیل نقل کرنے کے بعد ایک مختصر مگر جامع فیصلہ یہ صادر کر دیا ہے کہ:

"والذی تقرر علیہ العمل ان ابن اسحٰق الیہ یرجع فی المغازی والایام النبویۃ مع انہ یشذ باشیاء وانہ لیس بحجۃ فی الحلال والحرام" (تذکرۃ الحفاظ)

یعنے اس بات پر عمل قرار پایا ہے کہ بے شک محمد بن اسحٰق کی طرف مغازی اور عہدِ نبویؐ کی تاریخ میں رجوع کیا جائے تو با ایں ہمہ وہ شاذ و نادر روایتیں بھی ذکر کرتے ہیں۔ (مطلب یہ کہ وہ ایسی روایتیں بیان کرتے ہیں جو محدثین میں رائج نہیں ہیں۔) اور بے شک وہ حلال و حرام کے باب میں (محدثین کے نزدیک) حجت نہیں ہیں۔

صاحب "میزان الاعتدال" کا فیصلہ بھی اوپر گزرا کہ "وما انفرد بہ" (ان سے جو تفردات واقع ہوئے ہیں۔) "ففیہ نکارۃ" وہ عمل کے قابل نہیں بلکہ وہ منکر ہیں۔ مسجد کے دروازے پر اذان والی حدیث میں بھی یہ بے شک منفرد اور تنہا ہیں۔ اور یہ ان کے تفردات میں سے ہے۔ ان کے علاوہ

کسی محدث نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لہذا ان کبار ائمۂ جرح وتعدیل کے فیصلے کے تحت یہ روایتِ محمد بن اسحٰق عمل کے قابل اور حجیت کے لائق نہیں رہی۔ روایت ودرایت اور تعامل و توارث کے یکسر خلاف اور لائق انکار ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو" کتاب القول الاظہر فی ما یتعلق بالاذان عند المنبر۔

روایت محمد بن اسحٰق

نیز محمد بن اسحٰق کی اس روایت کے بارے میں انیس[19] نقادوں کی شدید جرح وتنقید سُن لینے کے بعد بھی مزید مخالفین روایت میں سے خود اُن کے استادِ حدیث حضرت زہری اور اصحاب زہری کی ایک طویل فہرست بھی ملاحظہ ہو:

"وخالفه غیر واحد من اصحاب الزهری[20] یونس[21] وعقیل[22] والماجشون[23] عند البخاری وغیره وابن ابی ذئب[24]، عند احمد وابی داؤد وابن ماجه وصالح[25] وسلیمان[26] التیمی، عند النسائی کلهم عن الزهری عن السائب بن یزید بدون هٰذا اللفظ" (علی باب المسجد) وقد رواه محمد بن اسحٰق ایضا عن الزهری بدون هٰذا اللفظ"

(آثار السنن: ص۹۴ ج ۱)

دیکھیے یہاں ان راویانِ حدیث کی روایتوں میں علی باب المسجد کا لفظ نہیں ہے۔ انہوں نے اس روایت کو "باب مسجد" کے بغیر ہی بیان کیا ہے۔ اب

ایک ادنیٰ تامل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ:

"بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے فقرے کے کئی جملوں بعد "علی باب المسجد" کا جوڑ صحیح نہیں ہے۔ روایتاً بھی درایتاً بھی۔ ادھر بین یدی کہہ کر قریب کا مطلب لیا اور ادھر باب المسجد کہہ کر بعید کا مطلب نکالا جو یقیناً: ؏

ببین تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

کی قبیل سے ہے "لان التاذین عند الخطبة لو کان علی باب المسجد لم یکن بین یدیه صلی اللہ علیه وسلم اذ لا یقال بین یدیه"

(آثار السنن) (خطبہ کے وقت کی یہ اذان اگر باب مسجد پر ہونا مشروع تھی تب تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں ہو سکتی اور "بین یدیہ" کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔)

امام نسائی کی وہ حدیث جو بھی حضرت سائب بن یزیدؓ سے مروی ہے، یہ حدیث ابی داؤد سے متعارض ہے۔ چناں چہ حدیث نمبر ۲ کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن منبر پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے تو حضرت بلالؓ نے اذان دی اور جب آپؐ منبر سے اترے تو اقامت کہی اور یہی معمول حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی رہا۔

اس حدیث میں اذان اور اقامت کی ذمہ داری ایک ہی موذن کے سپرد کی گئی ہے اور الفاظِ حدیث خود صاف بتلاتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ساتھ

اور قریب میں واقع ہو رہے ہیں۔ منبر پر تشریف رکھتے ہی اذان کہی اور وہاں سے اترتے ہی اقامت کہی۔ اور اگر ان دونوں ذمہ داریوں کی جگہ الگ الگ متعین کی جاتی اور مسجد کے باہر، مسجد کے دروازے پہ اذان دی جاتی تو پھر اقامت کے لیئے وہاں سے صفیں پھاندتے اور چیرتے ہوئے آنے کی نوبت آتی اور یہ صریح "تخطّی" ہے جس سے شریعت نے روکا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ اذان واقامت دونوں کا محل وقوع ایک ہے، جس طرح اقامت کی جگہ امام کے پاس ہوتی ہے اسی طرح اذان بھی خطبہ کے وقت امام کے پاس ہی ہونی چاہیئے۔ اور اسی بات پہ امّت کا توارث بھی ہے۔

" فلو کان یؤذن علی باب المسجد ثم یدخل فی الصف الاول للاقامۃ لزمہ التخطی وھو منھی عنہ فدل علی ان التاذین عند الخطبۃ والاقامۃ عند النزول کان محلھما واحدا ومحل الاقامۃ عند الامام فکذلک التاذین عند الخطبۃ محلہ عند الامام وبذلک جری التوارث علی ما قالہ صاحب الھدایۃ " (آثار السنن ج ۱ ص ۹۴)

فرضی توثیق

تھوڑی دیر کے لیئے مان لیں کہ راوی حدیث محمد بن اسحٰق ثقہ، عدول اور معتبر اور ان کی یہ خبر واحد اور تفرد روایت بھی بالفرض صحیح اور بالکل صحیح تب بھی وہ ہمارے اس مسئلہ میں ہم سے مزاحم نہیں ہے بلکہ غور کریں تو در پردہ وہ ہمارے اس مسلک کی تائید ہی کر رہی ہے۔ کیونکہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد دروازے رہے ہیں اور ان میں سے ایک دروازہ مصلّے کے بازو اور منبر سے متصل قبلہ کی طرف موجود تھا۔

وکانت لہ ثلثۃ ابواب وکان احد الابواب معاذیا للمنبر۔ (عمدۃ القاری: ص ۲۵۵: ج: ۲)

مسجد نبوی کے اس وقت تین دروازے تھے اور ایک دروازہ تو منبر نبوی کے عین محاذی (سامنے) تھا۔

تطبیق حدیث

علامہ سمہودی مدنیؒ اپنی کتاب "تاریخ خلاصۃ الوفاء باخبار دار المصطفےٰ" میں فرماتے ہیں:

" ان المسجد الشریف جعل لہ ثلثۃ ابواب باب فی مؤخرہ الی جھۃ القبلۃ الیوم یدخل منہ الی المقصورۃ وھٰذا قد سد قدیما وباب عن یمین المصلّی وباب عن یسار القبلۃ فی محاذات الباب قبلہ یدخل منہ للمقصورۃ "

(تاریخ خلاصۃ الوفاء)

مسجد شریف کے تین دروازے بنائے گئے تھے۔ پہلا وہ دروازہ تھا جو اب قبلہ کی جانب سے جس سے

مقصورہ کی راہ تھی، یہ دروازہ شروع سے بند کردیا گیا ہے، دوسرا دروازہ مصلّے کے داہنی جانب ہے اور تیسرا قبلہ کی بائیں سمت بند شدہ دروازہ کے محاذی د سامنے ہے۔ (تاریخ خلاصۃ الوفاء)

یہی علمائے اہل حق اور اہلِ ظواہر کے مابین متنازع فیہ ہے۔ ظاہر بینوں نے اس تیسرے دروازے کو متعین کیا تاکہ ان کے دعویٰ کے مطابق یہ خارجِ مسجد ہو جائے اور ہمارے نزدیک "بابِ مسجد" سے وہ دروازہ مراد ہے جو قبلہ کی جانب ہے اور اب مسدود (بند) ہے۔ اور یہ یقیناً مسجد کے اندر ہے اور منبر کے قریب ہے۔

اس پہلے دروازے پر جواب بند ہو چکا ہے جہاں سے مقصورہ کو جانے کا راستہ ہے اور یہ مسجد کے اندر قبلہ کی سمت منبر سے متصل ہے۔ اور یہاں کھڑے ہو کر حضرت بلال رضؓ نے اذان دی تو یہ "بین یدیہ" "بین یدی الخطیب"۔ "بین یدی الامام" "قریبا منہ"۔ "علی المنبر"۔ "عند المنبر"۔ "مقابل المنبر"۔ اور "وجاہ المنبر" کے معنی میں ہے کہ نہیں؟

—— یقیناً ہے —— پھر تعارض و تخالف کہاں رہا —— ؟؟

الحمد للہ! اس معنی میں فقہی روایات حدیثی روایات اور مفسرین کے اقوال و آراء میں تطابق و توافق ہو جاتا ہے۔ اب کسی قسم کی نزاع و مزاحمت نہیں رہ جاتی۔ یہ عام روایات حدیث اور محمد بن اسحاق کی روایت کردہ منفرد حدیث میں تطبیق کی سب سے عمدہ اور سب سے بہتر نظیر و تمثیل ہے۔

ع آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

لیجئے! ایک اور حدیث بھی پیش کی جاتی ہے۔ جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مسجدِ نبوی کے متعدد دروازے تھے اور ان میں سے ایک دروازہ تو منبرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب اور متصل تھا۔ امام بخاریؒ نے بخاری میں باب الاستسقاء فی المسجد الجامع کے تحت یہ روایت لائی ہے:

عن انس رضؓ بن مالک یذکر ان رجلا دخل یوم الجمعۃ من باب کان وجاہ المنبر الخ

بخاری شریف: ج اول: ص ۱۳۷

حضرت انس رضؓ بن مالک نے ایک شخص کا تذکرہ اس طرح سے کیا ہے کہ وہ جمعہ کے دن مسجد کے اندر اس دروازہ سے داخل ہوا جو منبر کے قریب تھا۔ (بخاری شریف)

ہم حدیث کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وقت متعدد دروازے تھے۔ تب ہی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کو تخصیص کرنی پڑی کہ اس دروازے سے جو منبر کے سامنے ہے۔ ورنہ اس انداز سے نہیں کہا جاتا اور وہ اس صفت سے متصف بھی نہ کرتے۔ بلکہ انھیں مطلق باب کہہ دینا کافی ہو جاتا۔ مگر چوں کہ وہاں حقیقت ہی دوسری تھی۔ متعدد باب تھے اور ان کا الگ الگ نام تھا

اس لیئے منبر کے قریب والے دروازے کی نشان دہی کی اور اس سے دوسرے دروازوں کی استثناء مقصود تھی۔ سو وہ اس تخصیص سے حاصل ہو گئی۔

یہاں ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راوی حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ تو استماعِ خطبہ میں مشغول تھے انہیں کیا خبر کہ کون کس راستے سے داخل ہو رہا ہے؟ کیوں کہ یہ تو پیٹھ پیچھے والا معاملہ ہے اور دروازے بھی عموماً مساجد میں خارج مسجد ہی ہوا کرتے ہیں۔ تو یہ اشکال پیدا پیدا ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اس کا جواب حفظِ ماتقدم کے طور پر دے ڈالا کہ "من باب کان وجاہ المنبر"۔ اجی وہ اس دروازے سے داخل ہوا جو منبر سے متصل یا قریب واقع ہوا ہے۔ اور یہ پہلی صف سے لے کر آخری صف میں بیٹھا ہوا شخص بھی بآسانی دیکھ سکتا ہے۔ اور اگر وہ دروازہ خارج مسجد ہوتا اور پیٹھ پیچھے ہوتا تو مڑ کر دیکھنے کی ضرورت پڑتی اور یہ آدابِ خطبہ کے خلاف ہے اور یہ حکم پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔

خطیب کو دیکھتے رہنا اور قبلہ رو ہو کر بیٹھنا اور ادھر اُدھر گھومے پھرے حرکت کئے بغیر بیٹھنا یہ خطبہ کے آداب میں سے ہے اور ایسی حرکت حضرت انس رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت سے بعید ہے۔ یہ محض ایک ظنی اشکال اور فرضی احتمال تھا ورنہ حقیقت میں وہ تو پہلی صف میں منبر کے قریب ہی تھے۔ اور اس کی دلیل وتصریح خود "فتح الباری" میں موجود ہے۔

"وزاد احمد فی روایۃ ثابت عن انس رضی اللہ عنہ انی لقائم عند المنبر الخ"

(فتح الباری: جلد ثانی: ص۴۰۲)

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں یہی روایت ثابت جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اس میں اس قدر اضافہ کیا ہے کہ بے شک میں منبر کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔"

اور پھر اس کے بعد من باب کان وجاہ المنبر والی روایت لائی ہے۔

لغوی اصطلاح

یہاں ہم مفہومِ روایت کے ساتھ "وجاہ" کی لغوی اصطلاح پر بھی تھوڑی بحث کرتے چلیں گے۔

المنجد میں ہے:

(واجَہَہ۔ وِجَاھًا ومواجھۃً) قابلہ وجھہ بوجھہ ـ یقال ھم وجاہ الف۔ ای زُھاءُ الفٍ۔ الزُھاءُ۔ المقدار ویقال عندی زُھاء خمسین درھمًا۔ (المنجد۔ ص۹۸۳)

(حاشیہ: بہ وجھاً لوجہ ویقال لقیتہ مواجھۃً ووجاھاً ای قابلہ)

مترجم "المنجد" لکھتا ہے:

واجھہ وجاھا ومواجھۃً: آمنے سامنے ہونا۔ (المنجد اردو ص۱۳۴۸)

کوئی عقل مند اس آمنے سامنے سے یہ نہ سمجھ

لے کہ تنو دو تنو گز یا میل دو میل کا فاصلہ بھی اس کے اندر آسکتا ہے۔ جب کہ وہ ایک سیدھ میں ہوں اور بالکل متقابل ہوں تو اس کے لیے صاحب منجد آگے اور جملہ بڑھا دیا "ھم وجاہ الف" وہ ہزار کے قریب ہیں۔ (المنجد اردو: ص۱۳۴۹)

"وجاہ العدو' ای مقابلھم"۔

(مجمع البحار، ص۲ ج: ۵)

ان لغوی اصطلاحات سے یہ معلوم ہوا کہ وجاہ کا معنی آمنے سامنے ہونا وہی زیادہ معتبر ہے جو مقابل اور قریب بھی ہو۔ ورنہ راوی حدیث کو بین یدی، امام، قدام جیسے عام فہم مستعمل الفاظ کو چھوڑ کر وجاہ کا فقرہ کیوں اختیار کرنا پڑا؟ اس لیے کہ اس خاص لفظ سے تقابل اور قرب دونوں کا ایک ساتھ مفہوم اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

مسجد کے اندر خطیب کے سامنے اذان! شارحین حدیث کے اقوال:

شارح الحدیث علامہ ملا علی القاریؒ مرقاۃ شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں:

(۱) ما ذکرہ محمد بن اسحٰق ھذا عند الطبرانی وغیرہ فی ھذا الحدیث ان بلالا کان یؤذن علی باب المسجد فقد نازعہ کثیرون ومنھم جماعۃ من المالکیۃ بان الاذان انما کان بین یدیہ علیہ الصلوۃ والسلام کما اقتضتہ روایۃ البخاری ھذہ اھ۔ (مرقاۃ المصابیح: ص۲۵ ج: جلد ثانی)

"امام طبرانیؒ اور دیگر کتب حدیث میں محمد بن اسحٰق سے یہ جو روایت آتی ہے کہ "حضرت بلالؓ نے مسجد کے دروازے پر اذان دی" اس کو بہت سے محدثین نے نہیں مانا اور مخالفت کی اور ان انکار کرنے والوں میں مالکیوں کی ایک خاص جماعت بھی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بے شک یہ اذان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوتی تھی جیسا کہ بخاری کی روایت خود اسی مفہوم کی متقاضی ہے۔"

شارح بخاری علامہ بدرالدین عینیؒ رقمطراز ہیں:

(۲) "وقد قلنا ان وجوب السعی وحرمۃ البیع والشراء بالاذان الذی یؤذن بین یدی المنبر لانہ ھو الاصل وبہ قال الشافعیؒ واحمدؒ واکثر فقہاء الامصار" (عمدۃ القاری ص۲۴۱ ج۳)

"اور ہم نے کہا کہ نماز کی طرف چلنا اور خرید و فروخت بند کرنا یہ اس اذان کے سننے پر واجب ہوتا ہے جو منبر کے سامنے ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہی اصل ہے اور اسی مسئلہ پر امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور شہر کے اکثر فقہا کا فتویٰ ہے۔"

(عمدۃ القاری شرح بخاری)
(ج: ۳، ص۲۴۱)

آگے علامہ عینی نے اس پر بڑی لمبی بحث کی ہے، جس کے بعض اقتباسات یہ ہیں:

"فلما كانت خلافة عمر رضي الله تعالى عنه وكثر المسلمون امر مؤذنين ان يؤذنا للناس بالجمعة خارجا في المسجد حتى يسمع الناس الاذان وامر ان يؤذن بين يدى النبى صلى الله عليه وسلم و بين يدى ابى بكر" (عمدۃ القاری ص ۲۹۰ تا ۲۹۱ ج ۳)

"خلیفۂ دوم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب لوگوں کی آبادی بڑھ گئی تو ان کی سہولت کی خاطر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے جمعہ میں پہلی اذان کے لیئے دو مؤذنوں کو منتخب کیا کہ وہ مسجد کے باہر اذان دیں اور پھر دوسری اذان کو امام کے سامنے ہی دینے کا حکم دیا۔ جس طرح کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔"

(عمدۃ القاری: ج ثالث: ص ۲۹۰ تا ص ۲۹۱)

یہاں علامہ عینی رح نے پہلی اذان کے لیے صاف طور پر **خارجا فی المسجد** کا لفظ بڑھا کر یہ مسئلہ خوب اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ یہ اذان مسجد کے باہر ہونی چاہیے۔ پھر دوسری اذان کے لیے بین یدیہ کا جملہ لکھ کر یہ باور کرا دیا کہ یہ مسجد کے اندر اور امام کے سامنے ہی ہونی چاہیے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس عمل پر توارث یا تعامل کہیئے یا دلیل یہ پیش کی ہے کہ ایسا ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔

"واختلف الفقهاء هل يؤذن بين يدى الامام واحد او مؤذنون؟ .... ان النداء عنده واحد بين يدى الامام ونص عليه الشافعي ..... الخ (عمدۃ القاری شرح بخاری۔ جلد ثالث ص ۲۹۱)

"آگے اس اختلاف کی بحث چھیڑی ہے کہ امام کے سامنے دی جانے والی اس اذان کا مؤذن ایک ہو یا ایک سے زیادہ۔؟ پھر جواباً کہا ہے کہ امام کے سامنے والی اذان میں ایک ہی موذن ہو اور یہی امام شافعی رح کی دلیل ہے۔"

(عمدۃ القاری شرح بخاری، جلد ثالث: ص ۲۹۱)

آج سے صدیوں سال پہلے علامہ عینی رح کو یہ کیا سوجھا نہیں معلوم، انہوں نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان کے صدیوں سال بعد اٹھنے والے اس فتنہ کا قلع قمع کرتے ہوئے پوری بصیرت سے اس کا انسداد اور سدباب اس طرح کر دیا کہ:

"فثبت الامر على ذلك كما ان اليوم العمل عليه في جميع الامصار اتباعا للخلف والسلف" (عمدۃ القاری ص ۲۹۳ ج ۳)

"پس یہ حکم پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا اور خلف وسلف کی اتباع کرتے ہوئے پورے شہروں میں آج تک اسی حکم پر عمل ہو رہا ہے۔"

(عمدۃ القاری: ج ۳: ص ۲۹۳)

(۳) "او سمّاه ثالثا باعتبار کونہ مزیدا علی الاذان بین یدی الامام والاقامۃ للصلوٰۃ" (ارشاد الساری شرح البخاری للعلامہ قسطلانیؒ ج۲ص:۱۴۷)

"پہلی اذان کو تیسری اذان نام اس لیے رکھا ہے کہ یہ امام سے لگی ہوئی اذان و اقامت کے علاوہ مزید اذان ہے۔" ج ۲، ص: ۱۴۷

(ارشاد الساری شرح البخاری للعلامہ قسطلانیؒ)

لیجئے علامہ قسطلانیؒ نے یہاں اس قضیہ کو اور آسان کردیا۔ انہوں نے ان سارے مشتبہ اور احتمالی الفاظ کو چھوا تک نہیں۔ غالبًا ان کی فراست نے یہ بھانپ لیا کہ آگے چل کر بعض ظاہر بین ان جملوں سے دوسرا مطلب اخذ کریں گے یا ان کے اندر تاویلات گھڑیں گے۔ اس لیے ان سے قطعاً گریز کیا اور ایک خاص جملہ ایسا وضع کیا جو کسی طرح بھی اہلِ ظواہر کے حلق سے نگلا نہیں جا سکتا۔ 'بین یدیہ' 'عند المنبر' 'وجاہ المنبر' وغیرہ فقروں سے قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے ایک خاص نقرہ 'بین یدی الامام' کا جڑ دیا۔

اور یہ عربی لغت ادب سے واقف حضرات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ "یدی" کے معنی نہ صرف قریب و نزدیک کے بلکہ ملے جلے اور ایک ساتھ مل جانے اور جڑ جانے کے آتے ہیں۔ اور "یدی الامام" امام سے لگ کر، مل کر اور جم کر کھڑے ہونے کو کہتے ہیں۔

مشکواۃ کی شرح "مرقاۃ" میں حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ:

(۴) "فلما کان عثمان کثر الناس ای المؤمنون بالمدینۃ وصار ذلک الاذان الذی بین یدی الخطیب لا یسمعہ جمیع اھل المدینۃ قالہ ابن حجر وھو الظاھر لاستبعاد سماع اھل المدینۃ جمیعھم الاذان الذی بین یدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام زاد عثمان النداء الثالث حدوثا وان کان فی الوقوع اوّلا ثم بعدہ اذان آخر قدیما مع الاقامۃ قال ابن حجر ثم نقل ھشام ھذا الاذان الی المسجد یمکن الجمع بین القولین بان الذی استقر فی آخر الامر ھو الذی کان بین یدیہ صلی اللہ علیہ وسلم او بان اذان بلال علی باب المسجد کان اعلاما فیکون اصل اعلام عمرو عثمانؓ ولعلہ ترک ایام الصدیق او آخر زمنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایضًا ..... فما احدثہ عثمان اجمعوا علیہ اجماعا سکوتیا۔"

(مرقاۃ المصابیح: ج ۲: ص ۲۴۹ تا ۲۵۰)

"اور جب حضرت عثمان غنیؓ نے یہ دیکھا کہ شہر میں لوگوں کی آبادی بڑھ گئی ہے اور خطیب کے سامنے دی جانے والی اذان کی آواز یہ اب ان تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ ان کے حق میں ناکافی تھی۔ (علامہ ابنِ حجرؒ نے ایسا ہی کہا ہے) تو آبادی اور دوری کی وجہ سے ظاہر ہے کہ آواز سب تک نہیں پہنچائی جا سکتی تھی اس لیے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دی جانے والی اذان کو باقی رکھتے ہوئے ایک تیسری اذان کی بناڈالی گو یہ حادث (نئی) ہونے کے اعتبار سے تیسری ہے مگر محل وقوع کے اعتبار سے پہلی پھر اس کے بعد خطبہ اور اقامت والی اذانیں یہ تو شروع سے چلی آنے والی ہیں۔ ابنِ حجر نے کہا: یہ تیسری اذان (جو خارج مسجد زوراء میں ہو رہی تھی۔) اب ہشام نے اس کو مسجد کے اندر منتقل کر دیا۔ (آگے فرماتے ہیں۔) دونوں قول کو جمع کرنا اس طرح ممکن ہے۔ جو اذان کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی یا حضرت بلال رضؓ نے باب مسجد پر دی تھی اس سے دراصل لوگوں کو معلوم کرانا ہی مقصود تھا اور حضرت عمرؓ و عثمان رضؓ کا یہ اضافۂ اعلان بھی اسی مقصد کے تحت تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور صدیق رضؓ اکبر کے دور میں آبادی کے لحاظ سے اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی...... اور جو کچھ حضرت عثمان رضؓ نے اضافہ کیا اس پر تمام صحابۂ کرامؓ کا بالاتفاق اجماع ہو چکا۔"

(۵) "ثم ان التاذین الاول فی وقته صلی اللہ علیہ وسلم والشیخین لما کان للاعلام الحاضرین ومن غاب منهم ایضاً کان الاحتیاج فی رفع الصوت فیه مالم یبق بعد زیادة الاذان الاول قبله فیکفی فی زماننا من رفع الصوت فی الاذان الثانی بقدر ما یکفی لاعلام الحاضرین اذ لا حاجة الی اعلام الغائبین لانهم قد أعلموا قبل فلا یفتقر ایضا الی ارتقاء المؤذن علی موضع مرتفع فافهم۔" (لامع الدراری)

"عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں یہی پہلی اذان مسجد کے حاضر باش اور غائبین دونوں کے حق میں اعلان کی غرض سے ہوتی تھی۔ اس لیے بلند آواز سے کہنے کی ضرورت تھی پھر بعد میں جب اس کے پہلے ایک اور اذان کا اضافہ ہو گیا تو اب وہ حاجت باقی نہ رہی۔ لہذا ہمارے زمانہ میں یہ اذان ثانی اتنی آواز سے کافی ہے جتنی حاضرین خطبہ کو معلوم کرانے کے لیے ضروری ہو۔ کیوں کہ اب غائب حضرات کو پھر سے خطبہ کی اطلاع دینے کی حاجت نہ رہی۔ ان کو تو پہلی اذان سے اطلاع مل چکی ہے۔ لہذا اب اس دوسری اذان کے لیے کسی اونچی جگہ چڑھ کر دینے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔"

(لامع الدراری علی جامع البخاری: ج: ۲، ص ۲۱)

(۶) "المشهور ان الاذان فی عهده علیه السلام کان واحدا و خارج المسجد عند الشروع فی الخطبة وکذلک فی عهد الشیخین ثم قرر عثمان رضؓ اذانا آخر قبل الشروع فی الخطبة خارج المسجد علی الزوراء حین کثر المسلمون ـــ والزوراء قیل بناء وهذا الاذان کان قبل الاذان بین یدی الخطیب بعد الزوال فانتقل الاذان الذی کان فی عهده علیه السلام الی داخل المسجد هذا هو الصحیح۔"

(العرف الشذی علی جامع الترمذی ص ۱۱۶ ج ۱)

۳ وقیل حجر وقیل سوق فی ... وقیل بناء ۱۲

"مشہور یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ہی اذان تھی اور وہ بھی خطبہ شروع کرنے کے پہلے مسجد کے باہر ہوا کرتی تھی اور حضرات شیخین رض کے زمانے میں بھی اسی طرح کا معمول رہا۔ پھر عثمان غنی رض نے خطبہ شروع ہونے سے پہلے مسجد کے باہر زوراء نامی جگہ پر ایک دوسری اذان مقرر کی۔۔۔ اور یہ زوراء کیا ہے؟ یہ ایک بڑا پتھر تھا یا بازار کا نام تھا یا وہاں کی ایک عمارت تھی۔ اور یہ زوال کے بعد دی جانے والی اذان بھی دراصل اس اذان سے پہلے تھی۔ جو خطبہ کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ اور جو اذان کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں خارج مسجد ہو رہی تھی، اب وہ داخل مسجد ہونے لگی۔ یہی صحیح ہے۔

(العرف الشذی علی جامع الترمذی: ج۱: ص۱۱۶)

(۷) "ان الاذان کان بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی باب المسجد داخلہ وھو بین یدی المنبر محاذیا لہ فلم یلزم کون الاذان خارج المسجد وان سلمنا علی ان معناہ وکان الاذان خارج المسجد فنقول ان الاذان کان علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الباب للاعلان المطلق فلما کان عثمان وزاد الاذان الاول للاعلان العام جعل الثانی عند المنبر قریباً منہ للانصات۔" (اعلاء السنن، المجلد الثامن ص۸۲)

"جمعہ کی اذان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسجد نبوی کے اس دروازے میں ہوتی تھی جو مسجد کے اندر تھا۔ اور وہ بھی منبر سے متصل اور مقابل تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اذانِ جمعہ مسجد کے باہر ہو۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیں کہ یہ اذان مسجد کے باہر ہوا کرتی تھی تب بھی یہ ہم کہیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عام اعلان کے لیے ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ اس لیے یہ ضروری ہوا کہ وہ دروازہ پر ہو۔ مگر حضرت عثمان غنی رض نے جب اس سے پہلے ایک اور اذان کی بنا ڈالی ہے تو اب یہ پہلی اذان اعلانِ عام کے مقصد کے تحت ہو گئی اور دوسری اذان منبر کے قریب محض لوگوں کو خاموشی اور خطبہ کی طرف متوجہ کرانے کے لیے ہوئی۔"

(اعلاء السنن: مجلد الثامن ص۸۲)

(۸) بخاری کی شرح "فتح الباری" میں علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے جہاں اذانِ ثانی پر مختلف اقوال و آراء نقل کیے ہیں، وہیں اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے ایک فیصلہ کن بات سنائی ہے: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو میں یہاں آپ کے سامنے رکھ دوں۔

"قال المھلب الحکمۃ فی جعل الاذان فی ھٰذا المحل لیعرف الناس بجلوس الامام علی المنبر فینصتون لہ اذا خطب

کذا قال، وفیہ نظر فان فی سیاق ابن اسحٰق عند الطبرانی وغیرہ عن الزھری فی ھذا الحدیث ان بلالا کان یؤذن علی باب المسجد فالظاھر انہ کان لمطلق الاعلام لالخصوص الانصات نعم لما زید الاذان الاول کان للاعلام وکان الذی بین یدی الخطیب للانصات۔" (فتح الباری ج۲ ص۳۱۴)

"مہلب" کہتے ہیں کہ اذان ثانی داخلِ مسجد ہونے میں یہ حکمت ہے کہ لوگ یہ جان لیں کہ امام کی نشست منبر پر ہو گئی ہے اس لیے اب سکوت اختیار کریں۔ آگے کہتے ہیں کہ ابن اسحٰق کی روایت کے پیشِ نظر یہ محل غور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت بلالؓ مسجد کے دروازے پر اذان دیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس سے عمومی طور پر معلوم کرانا مقصود تھا، اور خصوصی طور پر چپ رہنے کے لیے نہیں تھا۔ (سو اس کا جواب آج سے صدیوں سال پہلے علامہ ابنِ حجرؒ نے اس طرح دیا ہے کہ) ہاں! عہدِ عثمانیؓ میں جب پہلی اذان کا اضافہ ہوا تو وہ عام اعلان کے لیے ہو گئی۔ اور جو خطیب کے سامنے ہوتی تھی "انصات"، (خاموش اور چپ رہنے) کے لیے قرار پائی۔

(فتح الباری: ج ثانی ص۴۰۳)

لیجیے کتنا صاف اور کھلا فیصلہ صادر کر دیا ہے، وہ بھی آج سے کئی سو سال پہلے ہی۔ اب ذرا ان فقہی روایات کی طرف آئیے اور ان دونوں کو جوڑ کر دیکھیے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اذانِ ثانی مسجد کے اندر ہونا ہی مشروع ہے۔

حضرت مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی "عمدۃ الرعایۃ" حاشیہ "شرح وقایہ" میں اس طرح رطب للسان ہیں:

"ثم نقل الاذان الذی کان علی المنار حین صعود الامام علی المنبر علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر وصدر من خلافۃ عثمان بین یدیہ"

"جو اذان نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کے زمانوں میں مینار پر ہوا کرتی تھی اب یہ امام کے سامنے جگہ پائی اور مسجد کے اندر منتقل ہو گئی اور اس زائد اذان نے مینار پر جگہ پائی۔"

(عمدۃ الرعایۃ: حاشیہ شرح وقایہ)

اس سے یہ صاف نتیجہ نکلا کہ مینار پر اذان "اعلام للغائبین" کی غرض سے تھی۔ اور منبر کے سامنے اذان یہ "اعلام للحاضرین" کی غرض سے ہے۔

صاحب "مراقی الفلاح" نے بڑی زیرکی اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی عبارت میں ایک نکتہ یہ قائم کر دیا جس سے کسی طرح کا شک وشبہ باقی نہ رہا۔ فرمایا کہ

"والاذان بین یدیہ جری بہ التوارث کالاقامۃ بعد الخطبۃ"

(مراقی الفلاح ص ۳۰۹)

یعنی امام کے سامنے والی اذان ایسی ہو جیسی خطبہ کے بعد اقامت ہوتی ہے۔ گویا اس اذان ثانی کو اقامت سے تشبیہ دی گئی اور اس سے مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس طرح اقامت مسجد کے اندر ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح اذان بھی داخل مسجد ہے۔ ورنہ کالاقامۃ کی اضافت کا فقرہ بیکار اور بے جا ہوتا اس لیے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحب "مراقی الفلاح" فقیہ و محدث ہونے کے ساتھ ساتھ ملھم من اللہ بھی تھے۔ ان کی فراست نے یہ بھانپ لیا کہ آگے کوئی صاحب جدت پسندی کی رو میں بہ کر اذان ثانی کو مسجد سے نکال باہر کردیں اور عام فقہی کلیہ لایوذن فی المسجد میں داخل کردیں۔ اس لئے انھوں نے یہاں "کالاقامہ" کی قید بڑھادی تاکہ کسی کو اس میں کلام کی گنجائش نہ رہے۔ پھر مزید براں یہ کہ جری بہ التوارث کا خاص فقرہ بھی چسپت کردیا۔ اور مخالفین کا ہمیشہ کے لیے منہ بند کردیا۔

فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

غرض ان بے شمار حقائق اور بے پناہ شواہد سے یہ مسئلہ روز روشن سے زیادہ واضح اور اظہر من الشمس ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر اور وہ بھی خطیب کے روبرو دینا ہی مسنون و مامور ہے اور یہ اذان شروع سے اب تک یعنی صدر اول (زمانۂ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین) میں ہونے کی وجہ سے نہ صرف حد جواز بلکہ حد تواتر کو پہنچ گئی۔

پھر جب پہلی اذان کی زیادتی اور دوسری اذان کے داخل مسجد ہونے پر اجماع امت ہو گیا اور اجماع بھی اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں کثرت سے موجود تھے اور پھر یہ توارث و تعامل بھی ایسا زبردست تھا جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے شروع ہوا اور جس پر ایک ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے شاہد عدل کی طرح شہادت دی اور اپنی اپنی مہر تصدیق ثبت کردی، اب آگے اس کے اندر تنقید و تاویل کی کسی طرح گنجائش نہیں رہی

ھذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

کتبہ

[signature]

اس پورے مضمون کو شیخ المشائخ اعلیٰ حضرت مولانا ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری مدظلہ العالی نے حرفاً حرفاً سنا اور پسند فرماکر الحمد للہ اپنی مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے۔

نعت شریف

محمدؐ مصطفیٰ آئے، سواری نور کی آئی
بہاروں میں سراپا مستیوں کا بھاگ جاگا ہے
بلندی مسکرائی، پستیوں کا بھاگ جاگا ہے
دلوں کی خانہ ویرانی پہ رحمت کی گھٹا چھائی

کلامِ پاک کی اک روشنی جب دور تک پھیلی
فضاؤں میں مبارک خوشبوؤں کے سلسلے جاگے
منازل نور آور ہوگئے اور راستے جاگے
شہؐ کون ومکاں کی چاندنی جب دور تک پھیلی

منور ہوگئی انسانیت بھی دینِ احمدؐ سے
چھٹی تاریکیوں کی ڈگمگاتی دھند شہروں سے
سوادِ بے حیائی بجھ گیا معصوم چہروں سے
نکل آیا زمانہ بھی برائی کی سیہ زد سے

محمدؐ مصطفیٰ کے نور میں اللہ پنہاں ہے!
وہ دو عالم کا سرور شانِ امت، شانِ قرآں ہے

علیم صبا نویدی
(بی اے، علیگ)

نورِ ویلور

اسرارِ نور و نکہت حضرت مکان ہے یہ
آئینہ دارِ رحمت حضرت مکان ہے یہ
ویلور کی فضائیں کیوں کر ہوں منوّر
قلب و نظر کی دولت حضرت مکان ہے یہ
ظاہر میں پاک و شفّاف، آئینۂ تجلّی
باطن میں نیک سیرت حضرت مکان ہے یہ
دامن میں جس کی سمٹی ارض و سما کی وسعت
شاہِ عبرؔ کی سُنّت حضرت مکان ہے یہ
دونوں جہاں میں اس کی کوئی نہیں نظیر اب
خوش فکر و نیک سیرت حضرت مکان ہے یہ
روحانیت کے جلوے، جلوہ فشاں ہیں ہر سُو
صد باعثِ ارادت حضرت مکان ہے یہ

علیم صبا نویدی

نعتِ شریف

ڈاکٹر
وحید اشرف
پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو
دانش گاہ مدراس

آگیا دامنِ مصطفیٰؐ ہاتھ میں — یعنی فردوس کا راستا ہاتھ میں

سر پہ ہے خالقِ دوسرا کا کرم — یعنی دامنِ رحمتِ دوسرا ہاتھ میں

میری کشتی کو وہ ناخدا مل گیا — آگیا حشر کا آسرا ہاتھ میں

جس کو وہ مل گئے اس کو کیا خوف ہے — ہے خدا ساتھ میں، ناخدا ہاتھ میں

پائی دارین کی دولتِ بے بہا — ہے جو پائے شہِ دوسرا ہاتھ میں

دل کو کر کے حبیبِؐ خدا پہ فدا — لے لیا دامنِ مصطفیٰؐ ہاتھ میں

میں تو نا اہل تھا یہ ہے اُنؐ کا کرم — ہاتھ میرا خود لے لیا ہاتھ میں

عاقبت ہاتھ آیا وہی اے وحید
وہ جو تقدیر کا تھا ہاتھ میں!!

رابعہ بصری اور عبداللہ ابن مبارک کے درمیان ایک مکالمہ

از مولوی ابوالعرفان چیگری سجادہ عشاق محمد قادری لطیفی آستانۂ قادریہ اسلام پور ھبلی

غوث الثقلین قطب ربانی، محبوب سبحانی سیدنا سید عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کے شاگرد رشید حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ :۔

میں زیارت حرمین شریفین کے لیے جارہا تھا، اچانک میری نظر ایک برقعہ پوش خاتون پر پڑی جو میدان میں تنہا تشریف فرما تھیں ۔ معلوم ہوا کہ وہ حضرت رابعہ بصری ہیں ۔ میں پہلے ہی سے ان کے دیدار کا مشتاق تھا اُن کے پاس آکر کہا :

عبداللہ ابن مبارک : السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

رابعہ بصری : سلام قول من رب الرحیم : ان کو پروردگار کی طرف سے سلام فرمایا جاوے گا ۔ یہ میرے سلام کا جواب تھا ۔

حضرت عبداللہ ابن مبارک: آپ پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرمائے ۔ آپ یہاں کیوں رکی ہوئی ہیں ؟

حضرت رابعہ : ومن یضللہ فلا ھادی لہ : جس شخص کو خدا گمراہ کرے اس کے لیے ہدایت نہیں ۔ آپ اشارۃً یہ بتانا چاہتی ہیں کہ میں راستہ بھول گئی ہوں ۔

حضرت عبداللہ : آپ کہاں کا عزم رکھتی ہیں ؟

حضرت رابعہ : سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ : وہ پروردگار پاک ہے جو اپنے بندے کو بیت اللہ سے بیت المقدس کی جانب لے گیا ۔ یعنی میں حج سے فراغت کے بعد بیت المقدس جانا چاہتی ہوں ۔

حضرت عبداللہ : آپ یہاں کتنے دن سے ٹھہری ہوئی ہیں ؟

حضرت رابعہ : ثلٰث لیالٍ سویّا : پوری تین راتیں

حضرت عبداللہ : آپ کے پاس خورد و نوش کا سامان تو نظر نہیں آرہا ہے۔ پھر کس طرح گزارہ کر رہی ہیں ؟

حضرت رابعہ : ھو یطعمنی ویسقین : وہی مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے۔

حضرت عبداللہ : یہاں تو دور دور تک پانی نظر نہیں آتا۔ آپ وضو وغیرہ کیوں کر کرتی تھیں ؟

حضرت رابعہ : فلم تجدوا ماءً فتیمموا صعیدًا طیّبًا : پس اگر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی پر تیمم کر لیا کرو ۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میں نماز کے لیے تیمم کر لیا کرتی تھی ۔

حضرت عبداللہ : اگر آپ تکلف نہ سمجھیں تو میرے پاس کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں ۔ اگر اجازت ہو تو حاضر کردوں۔

حضرت رابعہ : واتموا الصیام الی الیل : پورا کرو تم روزوں کو رات تک : مطلب یہ کہ میں روزہ دار ہوں۔

حضرت عبداللہ : یہ تو ماہِ صیام نہیں ہے، پھر روزے کیسے ؟

حضرت رابعہ : ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم : خوشی سے کوئی امرِ خیر کرے حق تعالےٰ اس کی بڑی قدر دانی کرتے ہیں، خوب جانتے ہیں : یعنی آپ یہ بتانا چاہتی تھیں کہ یہ میرا فرض روزہ نہیں بلکہ نفل روزہ ہے ۔

حضرت عبداللہ : سفر میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے ۔

حضرت رابعہ : وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون : اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔

حضرت رابعہ بصری علیہ الرحمہا حضرت عبداللہ کے ہر سوال کا جواب قرآن مجید سے دینے لگیں آپ نے فرمایا :

حضرت عبداللہ : میں اپنی زبان میں گفتگو کرتا ہوں لہٰذا آپ بھی اپنی زبان میں گفتگو کریں۔

حضرت رابعہ : ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید : انسان کو کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا جس پہ ایک پہرے دار مقرر نہ ہو : یعنی انسان کو اپنی ہر بات کا خود جواب دہ ہونا پڑے گا ۔ اس لیے وہی کلام کرے جس کا اس کو جواب دینا نہ پڑے

حضرت عبداللہ : آپ کس قبیلے سے ہیں ؟

حضرت رابعہ : لا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولٰئک کان عنہ مسولا : اور جس بات کا تجھ کو علم نہ ہو اس کے درپے نہ ہو، تحقیق کان اور دل سب سے حساب لیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ وہ بات جس سے تم کو کوئی تعلق نہیں ہے نہ پوچھو۔

حضرت عبداللہ : معاف کیجیے مجھ سے غلطی ہوی۔

حضرت رابعہ : لا تثریب علیکم الیوم و یغفر اللہ لکم : آج تم پہ سرزنش نہیں اللہ تعالیٰ تم کو بخشے : آپ کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تم کو معاف کیا۔

حضرت عبداللہ : اگر آپ چاہیں تو میں اپنی اونٹنی پہ بٹھا کر قافلہ تک آپ کی راہبری کروں؟

حضرت رابعہ : وما تفعلو من خیر یعلمہ اللہ : اور تم جو بھی نیک کام کروگے اللہ اس کو جانتا ہے اور اس کا اجر ضرور دے گا۔

حضرت عبداللہ فورًا اپنی اونٹنی کو قریب کیا۔

حضرت رابعہ : قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم : مومنوں سے کہو کہ وہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مطلب یہ کہ تم ایک طرف ہوجاؤ تاکہ میں آسانی سے سوار ہوسکوں

حضرت عبداللہ فورًا ہٹ گئے۔ آپ سوار ہونا ہی چاہتی تھیں کہ اونٹنی ڈر کر بدک گئی جس سے ان کی چادر چلان سے الجھ کر پھٹ گئی۔ حضرت عبداللہ نے بہت افسوس کیا تو

حضرت رابعہ : وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدکم : اگر تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں سے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس میں آپ کا کیا قصور ہے یہ میری ہی شامت اعمال ہے۔

حضرت عبداللہ : میں اونٹنی کو باندھ لوں تاکہ آپ کو سوار ہونے میں سہولت ہو۔

حضرت رابعہ : ففھمنٰھا سلیمان : پس سمجھایا ہم نے سلیمان کو : یعنی تم اس کو سمجھاؤ اور باندھ دو، ورنہ سوار ہونے نہ دے گی۔

حضرت عبداللہ اپنی اونٹنی کو قابو میں کیا اور حضرت رابعہ بصری سوار ہوگئیں۔ اور

حضرت رابعہ : سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا

لمنقلبون : پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارے تابع کیا ہم میں اس کی
طاقت نہ تھی اور ہم اپنے خدا کی طرف لوٹنے والے ہیں : مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا
شکر ہے کہ اس نے حیوان کو ہمارے تابعدار بنایا ۔

حضرت عبداللہ کہتے ہیں" میں اونٹنی کی مہار پکڑے چلنے لگا اور بلند آواز سے اشعار پڑھنے لگا ۔

حضرت رابعہ : واقصد فی مشیک واغضض من صوتک : اپنی رفتار میں اعتدال
اختیار کرو اور اپنی آواز پست رکھو
ما قرا وما تیسر من القرآن : قرآن مجید پڑھو اور جس قدر ہو سکے
کوئی رکوع تلاوت کرو یہ ہزار درجہ بہتر ہے ۔

حضرت عبداللہ : اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ خوبیوں سے نوازا ہے ۔ ہر ایک آپ کی طرح کیسے
بن سکتا ہے ؟

حضرت رابعہ : وما یذکر الا اولا لباب : نہیں سمجھ سکتے مگر وہی لوگ جو عقل مند ہیں
یعنی نیک لوگ وہی ہیں جو نیک کام کرے اور نیک راہ پہ چلے ۔

حضرت عبداللہ : آپ کے خاوند بقید حیات ہیں ؟

حضرت رابعہ : یا ایھا الذین امنوا لا تسالوعن الشیاء ان تبدلکم تسئوکم :
اے ایمان والو ایسی باتیں نہ پوچھو اگر تم کو بتادی جائیں تو تم کو ناگوار معلوم ہوں :
ان کا مطلب یہ تھا کہ بلا ضرورت سوالات نہ کرو

اس پہ حضرت عبداللہ نے سکوت اختیار کیا ، خاموش چلنے لگے ۔ جب قافلہ سے قریب
ہوئے تو

حضرت عبداللہ : قافلہ میں آپ کا کون ہے ؟

حضرت رابعہ : المال والبنون زینتہ الحیوٰۃ الدنیا ۔ مال اور اولاد دنیاوی
زندگی بسر کرنے کے لیے زینت ہے ۔ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ قافلہ
میں ہمارے فرزند ہیں ۔

حضرت عبداللہ : آپ کے فرزند کیا کام کرتے ہیں ؟

حضرت رابعہ : وعلامات بالنجم ھم یھتدون اور علامتیں ہی تاروں سے راستہ پاتے

ہیں ۔ آپ یہ بتانا چاہتی تھیں کہ آپ کے لڑکے قافلہ کے سردار ہیں۔
حضرت عبداللہ اور حضرت رابعہ بصری قافلے میں گھومنے لگے اور

حضرت عبداللہ : آپ اپنے بیٹوں کے نام بتائیں ۔

حضرت رابعہ : واتخذوا اللہ ابراهیم خلیلا وکلیم اللہ موسیٰ تکلیما یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ : اور حضرت ابراھیمؑ کو اللہ دوست بنایا اور حضرت موسیٰؑ سے کلام کیا ۔ اے یحییٰ اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑو : یعنی مطلب تھا کہ تم قافلہ میں ابراھیم، موسیٰ اور یحییٰ کو آواز دو، میرے فرزندوں کے نام یہی ہیں ۔

حضرت عبداللہ نے ان تینوں کے نام کو پکارا تو تین لڑکے خیمہ سے باہر آئے ۔ حضرت رابعہ کو اونٹنی سے نیچے اتار لیا ۔

حضرت رابعہ : (اپنے فرزندوں سے کہا: فابعثوا احدکم بورقکم هذه الی المدینة فلینظر ایها ازکی طعاما فلیاتکم برزق منه : اب اپنے میں سے کسی کو یہ روپے دے کر شہر کی طرف بھیجو، پھر وہ تحقیق کرے کہ کون سا کھانا حلال ہے ۔ اس میں کچھ تمہارے پاس کھانا لے آؤ ۔

یہ حکم ہوتے ہی ان میں سے ایک شہر کی جانب نکل پڑا ۔ وہاں سے کھانا لایا اور حضرت عبداللہ کی میزبانی کی ۔

حضرت رابعہ : کلوا واشربوا هنیئا بما اسلفتم فی الایام الخالیه : کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گزشتہ ایام میں کئے ہیں ۔

حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں حیران و ششدر تھا کہ یا اللہ یہ کیسی نیک بخت خاتون ہیں کہ سوائے قرآنِ مجید کے کوئی لفظ اپنی زبان سے نکالتی نہیں ۔ آخر کار میں نے اُن کے فرزندوں سے کہا: آپ کا کھانا میرے لیے حرام ہے اس وقت تک جب تک کہ آپ مجھے اپنی والدہ ماجدہ کے مفصل حالات نہ بتلائیں ۔ حضرت ابراھیم نے فرمایا: چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے ہماری والدہ نے اپنی زبان سے کلام مجید کی آیات کے سوا کوئی اور جملہ نہیں نکالا جب کسی بات کی ضرورت ہوتی تو وہ قرآن پاک کی آیت تلاوت فرمادیتیں جس سے ان کا مطلب و منشا معلوم ہوجاتا ۔

یہ سن کر عبداللہ بن مبارک نے فرمایا ذٰلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم یہ اللہ ہی کا فضل ہے کرم ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے وہ صاحب فضل عظیم ہے ۔ ••

ڈاکٹر سیّد وحید اشرف　پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو، دانش گاہ۔ مدراس

برھان اردو کا ایک موقر جریدہ ہے، جو دہلی سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ اس کے مئی اور جون ۱۹۹۰ء کے شمارے میں ایک مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے 'ھل کنت الا بشراً رسولاً'۔ عربی دان حضرات عنوان کی اس ترکیب پر یقیناً حیران ہوں گے۔ لیکن ایک عالمِ قرآن نے یہی عنوان لکھا ہے اور ہم نے من و عن اسے نقل کر دیا ہے۔ ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

برہان کے مضمون کی ان دونوں قسطوں میں بشریتِ رسولؐ، علمِ غیب رسولؐ اور رسولؐ کے نورِ مجسّم ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ رسولؐ کو عام انسانوں جیسا بشر لکھا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) علمِ غیب رسولؐ کا بھی انکار کیا ہے اور رسولؐ کے نورِ مجسّم ہونے سے بھی انکار کیا ہے۔

بشریت رسولؐ اور علم غیب رسولؐ کو براہین قاطعہ سے علمائے اہلِ سنّت عقائدِ اہلِ سنّت کے مطابق ثابت کر چکے ہیں۔ اس لیے اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن رسولؐ کے نورِ مجسم ہونے سے انکار کر کے ایک نئے موضوع کو چھیڑا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر وہ نورِ مجسّم مان لیں تو رسولؐ کی بشریتِ عام بشریت سے ممتاز ہو جاتی ہے اسی لیے رسولؐ کو اپنے جیسا بشر کہنے والے رسولؐ کو نورِ مجسم کیوں ماننے لگے۔ اس لیے ہم اس مضمون میں اسی موضوع کی وضاحت کریں گے۔ ہدایت دینا خدائے عزّوجل ہی کا کام ہے۔

موضوع پر بحث کرنے سے پہلے یہاں
برہان کے جون ۱۹۹۰ء کے شمارے سے اس مضمون
سے ضروری اقتباسات پیش کرنا مناسب ہوگا۔ تاکہ
قارئین "اللطیف" کو مخالف دلیل اور طرزِ فکر
کا اندازہ ہوجائے اور وہ خود فیصلہ کرسکیں کہ سچائی
کس میں ہے۔

مضمون نگار کتبِ لغت کے حوالے سے
لکھتے ہیں :۔

" نور کے دو معانی متعین ہوتے ہیں ۔
۱) ایک ایسی روشنی جس پر نگاہ نہ ٹکتی ہو۔ (۲)
دوسرے روشنی خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو "

اس کے بعد وہ بحث کرتے ہیں :۔
"اب اگر ہم پہلا معنی مراد لیں یعنی ایک
ایسی روشنی جس پہ نگاہ نہ ٹکتی ہو تو ہم کو یہ کہنا پڑے
گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی ہستی کے مالک
تھے جن پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی ۔ تو اس رائے کو ایک
جاہل بھی دیوار پہ دے مارے گا۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں
کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کے نور کو مجسم فرمایا ہے
اس وقت بھی کوئی شخص اسے ماننے کے لیے تیار
نہ ہوگا۔ کیوں کہ آخر اس کی کوئی دلیل ہے؟ اگر
ہے تو وہ کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ
مجسم ہونے کی خبر قرآن میں ہے؟ یا حدیث میں یا
کوئی اور خارجی مرجع ہے؟

دوسری بات یہ کہ قرآن نے قرآن کو خود
دوسرے مقامات پر نور کہا ہے تو کیا ہماری نظر
قرآن پہ نہیں ٹکتی؟ ایسا ہرگز نہیں ہے ۔ لہٰذا اس
جگہ یہ پہلا معنی مناسب نہیں ہے۔

اب آئیے دوسرے معنی کی طرف ۔ وہ
ہے کہ نور سے مطلق روشنی لیا جائے، خواہ وہ کسی
بھی قسم کی ہو ۔ اب ہر شخص اپنے اپنے ظرف کے
بقدر مفہوم اخذ کرسکتا ہے "

اس کے بعد آگے چل کر لکھتے ہیں :۔
" ایک روشنی سورج میں ہوتی ہے، ایک
ستاروں میں ہوتی ہے اور ایک چاند میں ہوتی ہے
لیکن علم و ہدایت کی روشنی چاند، سورج اور
ستاروں کی روشنی سے کہیں زیادہ برتر ہے ۔
آپؐ نور تھے ہدایت کے، آپؐ نے ہدایت کے نور
سے کفر و ضلالت کی تاریکیوں کو ختم کیا۔ اس کے
برعکس یہ سمجھنا کہ آپؐ کی تخلیق مٹی سے نہیں بلکہ نور
سے ہوئی یہ عقل میں آنے والی بات نہیں اور نہ
اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس کا
حقیقت سے کوئی تعلق ہی ہے ۔ یہ بات دنیا کے سامنے
بالکل واضح ہے کہ آپؐ کے والد بھی تھے اور والدہ بھی
آپؐ نبوت سے سرفراز ہوئے اور ہدایت کا مینار بنے
اور نور ہدایت سے معمور کئے گئے۔ اب اس نور کو
ظاہری معنی پہنانا سطحی علم کی عکاسی کرتا ہے "

مجلّہ برہان کے مضمون کا اقتباس یہاں ختم ہوا۔ اب ہم اپنا مضمون شروع کرتے ہیں۔

اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ مضمون نگار کی بحث کا طریقۂ کار یہ ہے کہ پہلے انھوں نے نور کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے اور کتب لغت اور بعض اہلِ علم کے اقوال کو پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے نور کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے اُن کے پاس سوائے اٹکل کے کوئی وسیلہ نہ تھا اس لیے ان سے استناد کرنا درست نہیں ہے۔

موجودات کے بارے میں اگرچہ آج انسان کا علم بہت بڑھ چکا ہے پھر بھی ابھی بہت ناقص ہے موجودات کے بارے میں قرآن میں جگہ جگہ کچھ اشارے ملتے ہیں جو بہت غور طلب ہیں۔ صوفیاے اسلام نے موجودات کے بارے میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں لیکن ان کی تحقیق کا طریقہ سائنسی طریقہ سے مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ پہلے تزکیۂ نفس کرو اور دل کی آنکھ کھولو تو تم پر وہ چیزیں ظاہر ہو جائیں گی جو غیب میں ہیں۔ ان کا علم یا کشفی ہے یا نظری ہے یا کلامی ہے یا ان تینوں کو شامل ہے۔ موجودات کے بارے میں صوفیہ نے جو کچھ کہا ہے آج سائنس اپنے تجربات سے ان کی تصدیق کر رہی ہے۔ لیکن ابھی صوفیہ کی بہت سی تحقیقات یا اُن کے مکشوفات کی تصدیق سائنس کے ذریعہ ہونا باقی ہے۔ انھیں موجودات میں ایک شئے نور ہے۔ خدا خود نور ہے جس کی کنہ کو عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ نور مخلوق بھی ہے۔ اس لیے نور اور نور میں فرق ہے۔ خالق اور مخلوق میں فرق ہونا ضروری ہے۔

یہ موجودات کیا ہیں؟ اس کا جواب مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ یہاں تفصیلی بحث کا موقعہ نہیں ہے۔ لیکن اب تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ مادہ ایک ظاہری شکل ہے اور حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے مادہ کا وجود نہیں ہے۔ مادہ مجسّم انرجی ہے۔ اور انرجی غیر مادی ہے۔ روشنی آواز اور حرارت یہ سب انرجی ہیں۔ ایک انرجی کو دوسری انرجی میں بدلا جا سکتا ہے۔ مثلاً روشنی کو آواز میں اور آواز کو روشنی میں بدل سکتے ہیں۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر شئے کا ایک جزو لا یتجزّیٰ ہوتا ہے اور شئے اسی اجزاے لا یتجزیٰ سے متشکل ہوتی ہے۔ لیکن سائنس نے ایٹم کو تحلیل کر کے دکھا دیا کہ جسے لا یتجزیٰ سمجھتے تھے اُسے بھی تحلیل کیا جا سکتا ہے اور وہ تحلیل ہونے پر صرف حرارت بن جاتا ہے ایٹم بم کے ٹوٹنے سے یہی حرارت پیدا ہوتی ہے جو تباہی مچاتی ہے۔

اب جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر شئے مجسّم انرجی ہے تو خواہ وہ جمادات ہوں یا حیوانات ہوں یا نباتات ہوں، ہوا، پانی، انسان ہر ایک مجسّم انرجی ہے

خواہ ان کا وجود توالد و تناسل کے ذریعہ ہوا ہو یا کسی اور ذریعہ سے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے رسول ﷺ کی انرجی لطیف ترین نور ہے اور آپ نورِ مجسم ہیں۔ کیوں کہ نور بھی انرجی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ انرجی اور انرجی میں فرق ہے۔ روشنی کو دیکھ سکتے ہیں سُن نہیں سکتے۔ اس روشنی سے مراد وہ روشنی ہے جو دیکھی جا سکتی ہے۔ نور کی لطافت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ہر ایک کو نظر نہ آئے۔ مثلاً فرشتے نوری ہیں لیکن ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ آواز کو سُن سکتے ہیں، دیکھ نہیں سکتے۔ حرارت کو محسوس کر سکتے ہیں، سُن اور دیکھ نہیں سکتے اسی طرح ایک مادّہ کی انرجی اور دوسرے مادّے کی انرجی میں فرق ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے :۔

ایک بوتل میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بھر دیجیے اور دوسرے میں آکسیجن بھر دیجیے دونوں کو ہوا کہیں گے۔ یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی ہوا ہے اور آکسیجن بھی ہوا ہے۔ اب کاربن ڈائی آکسائیڈ میں ایک زندہ کیڑا ڈال دیجیے۔ وہ اس میں مر جائے گا۔ ایک نیم جان کیڑے کو آکسیجن گیاس میں ڈال دیجیے، اس میں تازگی آجائے گی۔ دونوں ہوا ہیں، لیکن دونوں میں یہ تضاد کہ ایک دوسرے کے بالکل برعکس ۔ اب اگر ہم قرآن کی آیات پہ غور کریں کہ مشرکین کو زندہ نہ کہو یہ چلتے پھرتے مردہ ہیں تو یہ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ مشرکین جس انرجی سے بنے ہیں اس میں موت کی خاصیت ہے جیسے کاربن ڈائی آکسائیڈ۔

کاربن ڈائی آکسائیڈ کے صاف کرنے کا قدرتی اور سائنسی طریقہ بھی ہے۔ اسی طرح انسان اپنے نفس کی گندگی کو صاف کر سکتا ہے اور اس کا ذریعہ ہے ایمان، اطاعتِ الٰہی، پیروئ سنّت اور ذکرِ الٰہی جیا ن چہ صوفیہ کے تجربات میں ملتا ہے ذکر کے ذریعہ۔ جب انھوں نے مکمل تزکیۂ نفس کر لیا تو اُن کا جسم نورانی ہو گیا۔ یعنی وہ بھی نور مجسّم ہو گئے۔ سید اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی درحدود ۸۲۹ھ) نے اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے حجرے میں ذکر کر رہے تھے۔ دورانِ ذکر اُن کا جسم نور بن کر پھیلتا گیا۔ اور پورا حجرہ نور سے بھر گیا اور جسم غائب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ نور سمٹنا شروع ہوا اور جسم بن گیا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن عقل کہتی ہے کہ اگر ہمارے جسم کی انرجی میں کوئی گندگی ہے تو اس کے صاف ہونے کا طریقہ مذہب کو بتانا چاہیے۔ اور صرف اسلام ایسا مذہب ہے جو یہ طریقہ بتاتا ہے۔ قرآن نے اطاعتِ الٰہی، پیروئ سنّت اور ذکرِ الٰہی کو ہی تزکیہ کا طریقہ بتایا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدمی سنّت کی پیروی کر کے اور ذکرِ الٰہی کے ذریعہ اپنا جسم نورانی بنا سکتا ہے تو رسول ﷺ کے نور مجسّم ہونے کی کیا تخصیص

باقی رہ گئی جس کا ذکر قرآن میں ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہا جا چکا ہے کہ انرجی اور انرجی میں فرق ہے۔ اسی طرح نور اور نور میں فرق ہے۔ سورج کی روشنی، چاند کی روشنی، موم کی روشنی اور دوسری روشنیوں میں فرق ظاہر ہے۔ ایک نور دوسرے نور کے مقابلہ میں زیادہ بسیط ہو سکتا ہے اور یقیناً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور تمام مخلوقات کے نور سے زیادہ بسیط ہے اور یہ واقعۂ معراج سے بھی ثابت ہے۔

برہان کے مضمون نگار نے نور کی تعریف کر کے ایک اشکال پیدا کیا ہے۔ لیکن اشکال کا سبب یہ ہے کہ مضمون نگار نے نور کی تحقیق میں غلط استناد کیا ہے اور یہ غلطی بدیہی ہے۔

مضمون نگار نے ایک قول یہ پیش کیا ہے کہ نور وہ ہے جس پر نگاہ نہ ٹھہر سکے اور پھر سوال کیا ہے کہ کیا قرآن پر جس کو نور کہا گیا ہے نگاہ نہیں ٹھہرتی ؟ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کاغذ کا نام قرآن ہے ؟ یا روشنائی کا نام قرآن ہے ؟ یا حروف کی شکلوں کا نام قرآن ہے؟ پھر حافظِ قرآن کے سینے میں جو قرآن محفوظ ہے اس میں نہ کاغذ ہے نہ سیاہی اور نہ حروف، تو وہ کیا ہے ؟ اس سے ظاہر ہے کہ مضمون نگار نے نور کی جس تعریف کو سند قرار دیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ قرآن کے نورِ ھدایت ہونے میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا یعنی یہ ایک کتابِ ہدایت ہے۔

اب فرض کیجیے کہ نور کی حقیقت ہمیں نہیں معلوم۔ سائنس کے انکشافات اب ہوئے ہیں۔ صوفیہ کے مشاہدات روحانی تجربات پر مبنی ہیں جس کے لیے دِل کی آنکھ کھولنا شرط ہے۔ ان حالات میں ہمارے رسولؐ کے بارے میں خدا نے جو فرمادیا کہ آپؐ نور ہیں (قد جاءکم من اللہ نور) تو کیا ہمیں اس کی تائید بغیر کسی تاویل کے نہ کرنی چاہیے ؟ اگر ہم رسولؐ کو نورِ مجسم مان لیں تو اس سے ایمان میں کون سی بدعقیدتی پیدا ہوتی ہے ؟ جب کہ خدا نے خود ہی آپ کو نور کہا ہے تو اس نور کی تاویل کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ بغیر ضروری علم کے تاویل میں گمراہی کا امکان قوی ہے۔ آیا عقل کی اس گمراہی سے بچنا بہتر ہے یا خدا کے قول کی تائید کر کے آپؐ کو نورِ مجسم اور نور ہدایت مان لینا بہتر ہے ؟ رسولؐ کا ہادی ہونا اظہر من الشمس ہے۔ یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہدایت بھی ہیں اور نورِ مجسم بھی۔

●●

ترجمہ:
ڈاکٹر مولوی حکیم سید شاہ افسر پاشا صاحب
شفاء ڈسپنسری - گڑیاتم

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

ہر قسم کی تعریف اس پاک پالن ہار پروردگار کے لیے ہے جو ساری کائنات کا خالق و کردگار ہے اور ہزاروں بار درود و سلام اس دربار گہر بار سرکارِ والا تبار محسنِ کائنات سرورِ عالم، فخرِ آدم، نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات پر اور آپ کی آل و اولاد پر امجاد و احفاد پر، ازواج اور اصحاب پر۔ جن کے طفیل و بدولت عقائد و احکام، اخلاق و عادات وغیرہ تعلیماتِ اسلام نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچے اور عام ہوئے۔ بے شک اللہ ان سے راضی اور خوش ہے۔ اور وہ اس سے راضی اور خوش ہیں۔

بات کہنے کو دو سال پرانی ہے مگر ہے اب بھی وہی بات ۱۹۸۹ء کی شروعات میں "کتاب "جواہر الحقائق" فقیر کے ہاتھ ترجمہ کی غرض سے پہنچی اور یہ حقیقت ہے کہ علوم معقولات اور فنونِ منقولات میں جہاں منطق و فلسفہ کی زمین سخت ہوتی ہے وہیں تصوف و سلوک اور اس سے متعلقات کی زمین اس سے بھی سخت، سنگلاخ و ادق ہوتی ہے اور یہ منتہی طالبین راہِ شریعت و طریقت و سالکینِ راہِ حقیقت و معرفت سے کوئی ڈھکی چھپی بات بھی ہے نہیں اور اس پر قدم رکھنا گویا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہمت نہیں بڑھی، توفیق نہیں ہوئی۔ اور کتاب قریب دو سال بعد پوری معذرت کے ساتھ واپس لوٹا دی۔

اس کے ٹھیک پندرہ بیس دن بعد جب خانقاہِ حضرت قطبِ ویلور میں حاضری دی تو سجادہ نشین خانقاہ اقطابِ ویلور، سلطان المشائخ حضرت المخدوم مولانا ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری مدظلہٗ العالی کی ملاقات و باریابی نصیب ہوئی اور کافی دیر گفت و شنید کے بعد واپسی کا ارادہ ہوا ہی تھا کہ انہوں نے اپنے دامادِ ذی بنیاد صاحبزادہ محترم مولانا سید شاہ محمد عثمان قادری عرف فصیح پاشاہ صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ ناظم دار العلوم لطیفیہ سے کیا سرگوشی کی اور کیا اشارہ فرمایا نہیں معلوم بس ساز چھڑ گیا۔ شکایت کا باب وا ہوا۔ اور کچھ ایسے انداز سے بات چھیڑی کہ ہر چند معذرت کیے باوجود انہوں نے اس کے

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

ہر قسم کی تعریف اس پاک پالن ہار پروردگار کے لیے ہے جو ساری کائنات کا خالق و کردگار ہے اور ہزاروں بار درود و سلام اس دربار گہر بار سرکارِ والا تبار، محسنِ کائنات سرورِ عالم، فخرِ آدم، نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات پر اور آپ کی آل و اولاد پر امجاد و احفاد پر، ازواج اور اصحاب پر۔ جن کے طفیل و بدولت عقائد و احکام، اخلاق و عادات وغیرہ تعلیماتِ اسلام نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچے اور عام ہوے۔ بے شک اللہ ان سے راضی اور خوش ہے۔ اور وہ اس سے راضی اور خوش ہیں۔

بات کہنے کو دو سال پرانی ہے مگر ہے اب بھی وہی بات ۱۹۸۹ء کی شروعات میں "کتاب "جواہر الحقائق" فقیر کے ہاتھ ترجمہ کی غرض سے پہنچی اور یہ حقیقت ہے کہ علوم معقولات اور فنون منقولات میں جہاں منطق و فلسفہ کی زمین سخت ہوتی ہے وہیں تصوّف و سلوک اور اس سے متعلقات کی زمین اس سے بھی سخت، سنگلاخ و ادق ہوتی ہے اور یہ منتہی طالبین راہِ شریعت و طریقت و سالکینِ راہِ حقیقت و معرفت سے کوئی ڈھکی چھپی بات بھی ہے نہیں اور اس پر قدم رکھنا گویا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہمت نہیں بڑھی، توفیق نہیں ہوی۔ اور کتاب قریب دو سال بعد پوری معذرت کے ساتھ واپس لوٹا دی۔

اس کے ٹھیک پندرہ بیس دن بعد جب خانقاہِ حضرت قطبِ ویلور میں حاضری دی تو سجادہ نشین خانقاہ اقطابِ ویلور، سلطان المشائخ حضرت المخدوم مولانا ابوالنصر قطب الدین شاہ سیدہ محمد باقر صاحب قادری مدظلہ العالی کی ملاقات و باریابی نصیب ہوی اور کافی دیر گفت و شنید کے بعد واپسی کا ارادہ ہوا ہی تھا کہ انہوں نے اپنے دامادِ ذی بنیاد صاحبزادۂ محترم مولانا شاہ سیدہ محمد عثمان قادری عرف نصیح پاشاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ناظم دارالعلوم لطیفیہ سے کیا سرگوشی کی اور کیا اشارہ فرمایا نہیں معلوم بس ساز چھڑ گیا۔ شکایت کا باب وا ہوا۔ اور کچھ ایسے انداز سے بات چھیڑی کہ ہر چند معذرت کے باوجود انہوں نے اس کے

ترجمہ پر پھر مجبور کر دیا اور پھر مجھے ماننے بغیر چارۂ کار بھی
نہیں رہا۔ اس لیے خموشی اختیار کی اور زبانِ حال سے عرض
کی ؎

بہ طبعم ہیچ مضمون بہ زلب بستن نمی آید
خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

سچ ہے: ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال است

اور اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا؟ اِدھر سے ہزار
معذرت اور اُدھر سے اتنی ہی شکایت و حکایت۔ اس
لیے سمجھا کہ یہ شگون آخر میرے نصیب میں ہے ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

چناں چہ حسبتہً للہ اور توکلاً علی اللہ جب
اس کام کے لیے خود کو پیش کر دیا اور اس زمین پر قدم رکھ
دیا اور قلم لے لیا تو ہمت نے یہ جواب دے دیا کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس لیے حیراں ہوں کہ: ؎

نہ شگوفہ ام نہ برگم نہ ثمر نہ سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بہ چہ کار کشت مارا؟

غرض ویلور سے واپسی کے دوسرے ہی دن کیا
دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا وسیع و عریض، سرسبز و شاداب بنگلہ
ہے۔ جس کے چاروں طرف راہیں ہموار و خوش گوار ہیں،
پُر کیف ماحول، پُر لطف منظر، جس کے ایک جانب مدرسہ
یا مکتب بھی ہے اور جس میں بچوں کی تعلیم ہو رہی ہے اور
تعلیم دینے والے بزرگ محترم مولانا ابوالحسن صدرالدین سید
شاہ محمد طاہر عرف حضرت پیر صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ
(المتوفی سنہ ۱۴۰۷ھ) ہیں۔

وہی شیرِ علی اسد اللہ الغالب والی رعب دار
آواز۔ وہی انداز گفت و شنید، وہی قد و قامت، وہی
ناک نقشہ اور وہی نورانی ہنس مکھ چہرہ بشرہ ہے۔ ہاتھ
میں عصا لیے ہوئے انتظامی امور میں سرگرم نظر آتے ہیں
اور میں آپ کے قریب بیٹھے محوِ تماشا ہوں۔ وہ مجھ سے
کچھ فرما رہے تھے یہ اب یاد نہیں رہا۔ ہاں اتنا یاد ہے
کوٹھی (بنگلہ) کی حد نظر وسعت کو دیکھتے ہوئے تعجب
کے ساتھ آخر میں نے آپ سے یہ پوچھ ہی لیا کہ حضرت یہ اتنا
وسیع مکان ذاتی ہے یا کرایہ کا؟ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ دل
پسیجتا تھا اور شرمندہ تھا کہ ایسا سوال اور ایسی جرأت
کیوں کی؟ حضرت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اس
میں شک کرنے کی کیا بات ہے؟ یہ تو ہمارا ذاتی ہے
اتنا سننا تھا کہ آنکھ کھل گئی اور صبح کی اذان ہو رہی تھی۔

اس خواب کی میں نے یہ تعبیر دی کہ حضرت
کو یہاں رہتے ہوئے بھی جس طرح مدرسہ اور اس کے نظام
سے شغف و تعلق اور عشق تھا، خلقِ خدا کی خدمت کے لیے
اپنے آپ کو وقف کیا اور اپنے ہر آرام کی قربانی دی اور من
تن دھن سے اپنے خاندانی بزرگانِ دین کے اس لگائے ہوئے
پودے پر جان کی بازی لگا دی اسی طرح وہاں پہنچ کر بھی وہی
جذبہ اب بھی کارفرما ہے۔ جس کے صلے میں جنت کا وہ

عالی شان مکان آپ کو نصیب ہوا ہے۔

چوں کہ آپ کو اپنے اہلِ خاندان کی یادگار و تاریخ ساز قلمی خدمات سے دلی لگاؤ اور گہرا تعلق رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں خانوادہ حضرت اقطاب ویلور کے ترجمان کی داغ و بیل عمل میں آئی اور یہ سالنامہ "اللطیف" کی شکل و صورت میں ظہور پذیر ہوئی اور جس پر آج الحمدللہ ٹھیک ۲۹ سال بیت گئے ہیں اور جہاں سے بہت سی کتابوں اور مطبوعہ وغیر مطبوعہ رسالوں کے تراجم مستقل کتابی شکل میں بھی نکلے ہیں۔ اور سالنامہ اللطیف میں قسط وار بھی آرہے ہیں۔ اس لیے اس خواب کے ذریعہ یہ اشارہ بھی دینا مقصود ہوگا کہ اپنے دادا جان کی کتاب "جواھر الحقائق" کے ترجمے کی خواہش اور برسوں کی تمنا کو اب بار آور ثابت کرنا ہے۔ اور مدتوں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونا ہے۔ اس طرح ہمارے بزرگوں کی خدمات کو پھر ایک بار منظرِ عام پر لانا ہے۔ دنیا سے رخصت ہوا تو کیا ہوا ؟ عالم فانی سے روپوش ہوا تو کیا ہوا ؟ اب بھی وہی ارادہ، وہی جذبہ اور وہی خیال ہے کہ ان بزرگوں کی بے لوث، پُر خلوص للہ فی اللہ خدمات کو عام کرنا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ان کے ترجمے کئے جائیں۔ اور عوام کے ہاتھوں پہنچائے جائیں۔ یہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے۔ مدرسہ ہے عوام و خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ خواب میں مدرسہ کی شکل دیکھنا یہ اسی جانب اشارہ ہے اور صدقۂ جاریہ سے کنایہ ہے۔

یہ مسلمات سے ہے کہ ہر کام کے لیے ایک ضرورت اور ہر ضرورت کے لیے ایک موزون وقت بھی ہوتا ہے اور کل امرٍ مرھون باوقاتھا بھی ایک حقیقت ہے۔ خلّاقِ عالم، قادرِ مطلق جس سے چاہتے ہیں کام لیتے ہیں۔ بظاہر یہ میرے بس کی بات نہیں ہے پھر بھی اللہ کو منظور ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں اور بے شک وہی اس میں آسانیاں اور راہیں ہموار فرمانے والے ہیں۔ **وماذٰلک علی اللہ بعزیز۔**

۲ - زیرِ نظر کتاب "جواھر الحقائق" اس میں شک نہیں اسم با مسمّٰی ہے۔ اس کا ایک ایک زینہ جہاں علوم و معارف کا اتھاہ خزینہ ہے وہیں رموز و دقائق کا ایک بیش بہا گنجینہ بھی۔ جسے شیخ المشائخ مخدوم الانام، منبع الکشف والالہام حضرت علامہ مولانا الحافظ الحاج سید شاہ عبداللطیف محی الدین قادری نقوی ویلوری قدس اللہ سرہٗ العزیز المتوفی سنہ نے آج سے ٹھیک ایک سو اڑتیس ۱۳۸ سال پہلے ۱۲۷۳ء سنہ سن بارہ سو تہتر ہجری میں تالیف فرمائی۔ اور اس کی طباعت تصنیف کے ٹھیک ایک سال بعد مدراس میں اس وقت کے مظہر العجائب نامی مطبع میں ۱۲۷۴ھ سنہ ہجری میں ہوئی ہے۔

تقطیع بڑی سائز کی (۸" × ۱۲¼") میں ہے۔

تقطیع بڑی سائز کی (8 × 12¼) انچ میں ۲۱ سطری اور کل صفحات ۱۸۱ ہیں زبان فارسی ہے اور اکثر بات کی وضاحت اور دلیل میں جابجا قدماء کی عربی کتابوں (کے حوالوں اور عبارات سے زینت بخشی ہے) کا بیشتر حصہ عربی عبارتوں سے مزین ہے

۳- کسی بھی کتاب کے ترجمہ میں الفاظ کی اصل حلاوت وبلاغت، باریکی ولطافت اور مزیداری پوری طرح پیدا نہیں ہو سکتی، پھر بھی اکثر مترجمین نے اتنی کوشش ضرور کی ہے کہ اصل کی لطافت وحقیقت سے کسی قدر روشناس کرایا جائے۔ اس لیے حتی الامکان اس کی روح لطافت کی بقا اور حسنِ معانی کی ادا پر پوری توجہ دی ہے تاہم اصل اصل ہی ہوتی ہے اور نقل نقل ہی۔

۴- ہم نے حتی الوسع الفاظ کی پوری رعایت کو مدنظر رکھ کر تحت اللفظ ترجمہ کیا ہے اور اس کا لحاظ رکھا ہے کہ جملوں میں سلاست وروانی ہو اور پڑھنے والے پر بوجھ نہ ہو۔

۵- محض لفظی ترجمے سے جہاں بات پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی ہے وہاں تحت اللفظ سے ہٹ کر حاصلی ترجمہ کر دیا ہے اور اس کی رعایت رکھی ہے کہ صاحبِ کتاب کا اصل مفہوم ضائع نہ ہو اور ان کا مافی الضمیر پوری طرح ادا ہو۔

۶- ترجمہ کے درمیان بین السطور قوسین میں جو عبارت ہوگی یہ مترجم کی سمجھی جائے یہ صرف بات کی پوری طرح وضاحت کے لیے شدید ضرورت پر ہوگی۔ ورنہ نہیں۔

۷- اہم عربی عبارات یا اس کے بعض جملے اسی طرح ہم اشعار کی جہاں ضرورت سمجھی جائے گی یہ اصل کتاب سے مزیداری اور چاشنی کی خاطر نقل کئے جائیں گے ورنہ صرف ان کے ترجمہ پہ اکتفا کیا جائے گا اور جہاں شعر کا ترجمہ ہوگا وہاں علامت شعر ۷ بھی پیش کی جائیگی اور جہاں شاعر کا نام یا کتاب کا حوالہ ہے اس کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔

۸- اردو زبان میں مستعملہ عربی اور فارسی کے الفاظ جو عام طور پہ رائج ہیں اور بولے جاتے ہیں ان کے ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی اور حاجت نہیں رہی اسلیے انھیں ایسے ہی بحال رکھدیا ہے۔

۹- اس ترجمہ کا انتساب سجادہ نشین خانقاہ محترم المخدوم شیخ الشیوخ اعلیحضرت فیض درجت سراپا خیر وبرکت مولانا ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری دامت برکاتہم وعمت فیوضہم اور حضرت المخدوم مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ کی پُرخلوص ذوات وشخصیات کی طرف کرتا ہوں۔ جن کی خصوصی توجہات وعنایات کے نتیجہ میں مدتوں بعد یہ فارسی سے اردو جامہ پہنانے کی تخلیق عمل میں آئی۔

۱۰- دعا ہے کہ اللہ تعالی اصل کی برکت سے نقل کو بھی شرف قبولیت سے نوازے۔ اور فقیر مترجم کو خلوص نیت اور علم عافیت کے ساتھ ساتھ عملِ مزید کی توفیق انیق بھی مرحمت فرمائے۔ آمین: بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ اجمعین —

(حکیم سید افسر باشاہ)

جواھر الحقائق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربنا آرنا حقائق الاشیاء واھدنا صراط السّواء نبیّك سیّدالانبیاء والہ واصحابہ الاصفیاء

اے ہمارے پالنہار ہم پر ہر چیز کی حقیقت ظاہر فرما اور ہمیں ہدایت دے جو اس ٹھیک راستے پر چلنے کی جو تیرے نبیؐ سید الانبیاء کا ہے اور ان کے پاک اور برگزیدہ آلؓ واصحابؓ کا ہے۔

اما بعد!

(اس کتاب میں) اللہ کی معرفت اور توحید کے سلسلے میں چند فوائد (مرتب) ہیں اور اس میں اللہ والی خدا لگتی باتیں بھی ہیں۔ اور (ضمناً) اس کی مخلوقات کو ظاہر کرتے ہوئے بعض ایسی مفید باتوں کا تذکرہ بھی ہے جن کے ذریعہ سے تمام عالم اور جسم انسان کی حقیقت اور جملہ موجوداتِ عالم کے مراتب کا حصار وشمار کرتے ہوئے انسان کے مرتبہ ومقام کی پہچان بھی ہو۔

اور اس کتاب میں دنیائے فانی کے نفع و نقصان، ناسوتی بدن کا فنا، اور موت کے بعد ملکوتی جسم وجان کی بقاء کے تعلق سے ایسی قیمتی اور مفید باتیں بھی ہیں جو ان حقائق کو خوب واضح کرتی ہیں۔ نیز آخرت کی ابدی زندگی پر اور ایک مردہ جسم کے پھر سے زندہ کیئے جانے اور اس کے متعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس میں ہم نے بڑے دلچسپ انداز سے ایسے دلائل قائم کئے ہیں (جو مسکت اور کافی ہیں) اور جو فلسفیوں کی لاحاصل تحقیقات اور بے خبروں کی فضول ولایعنی باتوں سے یقیناً پاک ہیں۔

یہ وہ مباحث ہیں جن میں انسان نفس و شیطان کی غلطان میں آکر ایک تنگ نظر کوتاہ بین کے لیے تشویش کا سبب بنتا ہے۔ اور وہ شک و شبہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ (حضرت) شاہ ولی اللہ (محدث) دہلوی قدس سرہٗ نے "الطاف القدس" میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ:-

"ایسے فلاسفی جو اللہ کے نبیوں کے عقائد سے اختلاف رکھتے ہیں یہ میرے نزدیک کتوں کی طرح ہیں بلکہ کتوں سے بھی کم تر ہیں۔ کیوں کہ کتے تو پرانی ہڈی سونگھا نہیں کرتے اور یہ نالائق دو ہزار سال کی بوسیدہ

ہڈیوں کو سونگھتے اور گڑے مردے اکھاڑتے ہیں۔ ان کی اس گمراہی کی بنا پر ان کی عقل بھی ناقص ہی رہتی ہے اور وہ ان کے اس علم کی وجہ سے اپنے آپ خوش بھی رہتے ہیں۔

گلشن ؎ "جسے اللہ خود گمراہ کرے اسے منطق و فلسفہ کا علم کچھ کام نہیں دیتا ایک ماہر فلاسفر تو موجودات کو حدِ امکان کے باہر نہیں سمجھتا اس لیے وہ اپنے فلسفہ کے نتیجے میں حیران و سرگردان رہتا ہے۔ (اور اپنے اس ناقص امکانی دعوے اور کم سمجھی سے) اللہ کی ذات کو ثابت کرنے کی سعیٔ ناتمام بھی کرتا ہے اور خود ہی اس (ورطہ) کے اندر ششدر و حیران بھی ہے۔ یہ کیسا نادان ہے جو آفتاب عالمتاب کو ایک ٹمٹماتے چراغ کی لو سے جنگلوں میں ڈھونڈ رہا ہے۔ (گویا آفتاب نصف النہار کے سامنے چراغ پیش کرتا ہے۔)

(شروع سے) جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اور ان کے سردار سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا (اپنی امت کو) علم سلوک اور تزکیہ نفوس کی تعلیم دینا اور وحیٔ الٰہی کے ذریعہ کھلی روشن دلیل پیش کرنا ہی ان کا اپنا طریقہ رہا ہے۔ نہ کہ اظہارِ حقائق و دقائق۔ ہاں (شدید ضرورت پر) کچھ رمز و اشارہ سے کہہ دیا، یا ان باتوں کو جن کی حقیقت سے عرب و عجم کے کان آشنا تھے اور وہ ان سے واقف تھے تو ان پر لب کشائی کی تو اس مقصد سے کہ خواص ان حقائق کی اصل حکمت اور راز کو جان لیں۔ اور عوام ان کے فہم و ادراک میں حیران اور سرگردان نہ ہوں۔

غرض یہ وہ حقائق ہیں جن پر لب کشائی کرنا زیب نہیں دیتا۔ اس لیے ہم خموشی کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اور دیدہ و دانستہ خود کو انجانا اور اَن دیکھا تصوّر کرتے ہیں۔ مگر وہ صوفی حضرات جنھوں نے حقائق کی کھوج و جستجو کے درپے ہو کر اس میں اختلاف پیدا کر دیا اور بالآخر نوبت ان کی الحاد تک پہنچی ہے (اس لیے ان کے اس الحاد کو دیکھتے ہوئے) ضرورت اب اس بات کی داعی ہے کہ حقائق و دقائق کا یہ راز سربستہ فاش کیا جائے۔ الضرورۃ تبیح المحذورات بے شک ضرورت نے پرہیز کو جائز قرار دیا۔ (اور گویا جس سے احتراز اور بچاؤ کا حکم تھا اب ضرورت نے اس کے اظہار پر قباحت کا لیبل چسپاں نہیں کیا بلکہ مباح کا فتویٰ صادر کر دیا ہے۔) تاہم عوام کی فہم و ادراک و سمجھ کے مطابق اس میں ان کی رعایت اور اس کا پاس و لحاظ ضروری ہے، جس سے ذاتِ باری تعالیٰ کی کُنہ و ادراک کے وہ پیٹے ہوئے پیچیدہ مقاصد کی وسعت کی رعایت بھی ہو اور نفس و شیطان کی قربت و نزدیکی سے دُور اور کتاب و سنّت کے مطابق بھی ہو۔

خاقانی ؎ طور سینا (کوہ طور) پر اڑان کی

اگر خواہش ہے تو بوعلی سینا کے بیٹے کی طرح اپنے پردوں کو تیز رکھ۔ اے بوعلی سینا کے بیٹو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو اپنے دلوں کے اندر سما لو۔ (مطلب یہ کہ اُن کے معارف و حکم کی باتوں کو سمجھنے کے لیے خود کو آمادہ کرلو اور پوری طرح چاق و چوبند رہو۔)

یہ من جانب اللہ ذوقی اور وجدانی باتیں ہیں جن کی سماعت سے دلوں میں پاکی اور بزرگی آتی ہے۔ ؎

بادشاہ خود ہی کسی بوڑھے فقیر کے در پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹائے تو اے دوست جلدی سے باہر آ۔ اندر ہی فخر سے اترائے مت بیٹھ۔ (یعنے خدا بندے سے محوِ کلام ہوتا ہے تو بندہ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر دور رہنے کی بجائے فوراً اس سے محوِ کلام ہوجائے۔)

جب یہ باتیں نقل و عقل کے موافق ہوں اور بزرگانِ خیر القرون کے (منشاء) کے خلاف نہ ہوں اور دل کو ان سے سکون و اطمینان نصیب ہو تو سمجھو کہ اب اس پر شیطان کو مجالِ اعتراض نہیں۔ (اب اس کی نہیں چلے گی۔) اتنا جان لینا ہمیں بس کرتا ہے اور یہی کافی ہے۔ بندہ کو اپنے مولا کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے احکام کی ادائیگی کے سوا اور کیا کام ہے؟ اور اس کو تو زید و عمر کے ساتھ کیا سروکار؟ ذٰلک تقدیر العزیز العلیم: یہی ربِّ عزیز و علیم کا منشا بھی ہے۔

اور اگر اس کے اس قول سے فلسفیوں کے خیالات بلکہ چند مشاہیر علماء اور بعض صوفی حضرات کی آراء میں ٹکراؤ ہے تو اسے ڈرنے کی کوئی بات نہیں: ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں

خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

یعنی خدا خود ہی جب مجھ سے سننے کے خواہاں ہیں تو میں کیوں اپنی زبان و قلم کو روک لوں؟ ایسی قناعت اور کفایت پر مٹی پڑے۔ خاک جھونکے۔

ربنا آمنا بما أنزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشٰھدین: اے ہمارے رب تونے جو کچھ بھی بھیجا اس پر ہم ایمان لائے اور تاجدار مدینہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی سو ہمیں گواہی دینے والوں میں شمار کیجیو۔

جس شخص کو اہل سنت و جماعت کے صحیح عقائد اور ائمۂ ملّت اور سلفِ صالحین کے طور طریقوں سے آگہی نہ ہو اور وہ حضرات صوفیاء کے حالات اور ان کی اصطلاح سے واقف بھی نہ ہوں تو ایسے شخص کو اس کتاب سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ نقصان اور تضییع اوقات ہے۔

"صاحب الطاف القدس" (شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) فرماتے ہیں کہ "صوفیاء کی کتابیں خواص کے حق میں عجیب التاثیر کیمیاء کی حیثیت رکھتی ہیں اور عوام کے حق میں زہر قاتل"۔ اس لیے جس کے اندر صوفیاء کی ان کتابوں کے سمجھنے کی تاب اور صلاحیت و استعداد نہ ہو اس کی نگاہوں سے ان کتابوں کو دور اور پوشیدہ رکھنے والے پر خدا رحم کرے۔

(پھر بھی عوام کو اگر اس کا سابقہ پڑ جائے) تو ایسی صورت میں (بے سمجھے الجھنے کے بجائے) یہ پوشیدہ

اور پیچیدہ کلام خود قائل پر سونپ دیں اور جس دن علام الغیوب کے سامنے یہ اسرار و رموز کا کہنے والا انھیں پیش کرے گا اس دن حق و باطل سب پر ظاہر ہوگا۔

گو کہ تصنیف و تالیف "مَنْ صَنَّفَ قَدِ اسْتَهْدَفَ وَمَنْ اَلَّفَ قَدِ اسْتَقْذَفَ کے حکم کے تحت ہدف و قذف کا سبب بنتا ہے۔ (مطلب یہ کہ جس نے تصنیف کی تو گویا اس نے خود کو نشانۂ ملامت بنالیا۔ اور جس نے تالیف کی اس نے بھی اپنے آپ کو گالی گلوچ کا مستحق ٹھہرایا۔ تصنیف و تالیف میں باریک فرق یہ ہے کہ تصنیف میں کتاب بنانا اور مضامین خود سے لکھنا ہوتا ہے اور تالیف میں دوسروں کے مختلف مضامین سے منتخب باتوں کا ترتیب دینا ہے اور یہاں یہ قولِ ہدف و قذف بزرگوں کے ہاں انتہا درجہ کے احتیاط پر مبنی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تصنیف و تالیف اس میں شک نہیں کہ ہدف و قذف کا باعث ضرور ہے۔ لیکن اس فتنہ و فساد کے دور میں سرکشی اور کس مپرسی کے عالم میں جب کہ اپنے محسن کے ساتھ دشمنی مول لی جا رہی ہے اور زمانہ اپنے مقصد سے کوسوں دور ہے تو ایسے وقت میں خلوصِ نیت کے ساتھ عمل قلیل بھی اجرِ جزیل کا سبب بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ پوری توجہ کے ساتھ اس کو قبول فرماتے ہیں۔ ؎ جادل کو کسی ایک کے حوالے کر (ذات وجود کے سپرد کر) پھر دیکھ کہ وہ وجود کے مختلف شکلوں اور طریقوں میں ہمیشہ سے تیرے ہی ساتھ تھا اور رہے گا بھی۔ ارشادِ باری ہے "ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔" (اور اگر اس کائنات میں اللہ کے سوا بھی کوئی دوسری ذات ہوتی تو نظامِ کائنات میں بہت بڑے پھوٹ اور اختلافات وجود میں آتے۔) کہا گیا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ نَاسٍ اَوَّلُ النَّاسِ۔ (بنی نوعِ انسان میں حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے ہیں جنھوں نے سب سے پہلے بھول و نسیان کو اپنایا۔ اور اس کا وقوع عمل میں لایا۔)

فتاویٰ قاضی خان میں ہے "تکلموا فی المجتہد قال بعضھم مَنْ سُئل عن عشر مسائل فیصیب فی الثمانیۃ و یخطئ فی البقیۃ فھو مجتہد" یعنی مجتہد کی پہچان میں علماء نے کلام کیا ہے۔ بعض علماء نے کلام کیا ہے بعض علماء نے یہ گُر پیش کیا ہے کہ جب اس سے دس مسائل پوچھیں اور اس میں وہ آٹھ مسائل تو ٹھیک بتادے اور دو میں غلطی کرجائے تو سمجھو وہ مجتہد ہے۔" اس اعتبار سے اگر انسان سے غلطی اور بھول و ذہول واقع ہوجائے اور خاص کر اس ناواقف و گنہگار سے تو ایسی خطا و نسیان کا ارتکاب غلطی میں شمار نہیں ہوتا۔ پس اللہ تعالیٰ لوگوں کو یہ توفیق دے کہ وہ قلم کی سرکشی اور قدم کی لغزش و زیادتی کی ہر اصلاح و درستگی میں اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ہر اس فانی (او رعارضی) کام سے جو نتیجۃً فضول و بے سود ہو اور آخرت کے ابدی کام سے اس کو کوئی تعلق نہ ہو دور رکھے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع البصیر (اے ہمارے پالنہار! ہماری اس دعا کو قبول فرما۔ بے شک آپ (ہر بات کو) سنتے ہیں اور (ہر کام کو) دیکھتے ہیں۔ قد تمت ترجمۃ المقدمۃ بعون اللہ تعالیٰ۔ (یہاں تک تو صاحبِ کتاب جواہر الحقائق کے تمہیدی کلمات رہے۔ اب اصل بات شروع ہوئی ہے۔ فائدہ نمبر ایک سے جو تصوف اور اس کے مبادیات پر منحصر ہے۔ ان شاء اللہ

اگلی قسطوں میں ملاحظہ ہو) جاری

تصنیف حضرت علامہ سید شاہ محی الدین عبد اللطیف قادری المعروف بہ قطب ویلوری رح قدس سرہ

جواہر السلوک

ترجمہ و تحشیہ ترجمہ و تحشیہ

پروفیسر سید وحید اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو دانشگاہ مدراس۔

گیارھواں فائدہ

(ابوداؤد) قیصری قصیدۂ فارضیہ کی شرح کے مقدمہ کے مقصدِ ثانی کی تیسری فصل میں سلوک کے سفرِ اول اور ولایت کے حصول کے طریقہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کو ضرور اپنا راستہ دکھاتے ہیں۔ اور ان کی ہدایت کرتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ انسان کے لیے انوارِ ربانی کے ظہور کے تین مقامات ہیں۔ اور ہر مقام پر کثیر ظلماتی اور نورانی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن پردوں کو اٹھانا ضروری ہے۔ تاکہ ذات باری تعالیٰ کی ازلی و ابدی صفات کا عرفان ہو سکے۔ جو اس کی ذات سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ لیکن انسان اس ازلی و ابدی حقیقت کے عرفان سے محروم ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے غیر میں مشغول ہے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ عبد اور رب کے درمیان[1] ایک ہزار مقامات ہیں اور سالک کے لیے ان تمام مقامات کا قطع کرنا ضروری ہے تو یہ انھیں تین مقامات کی فرع ہیں۔

مقامِ اول جو مولود کے لیے مقاماتِ نفس پر دلالت کرتا ہے وہ حیوان کی مانند ہے۔ جیسے دوسرے حیوانات ہوتے ہیں۔ جو اول کھانے پینے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ پھر اس پر بتدریج نفس کے دوسرے صفات ظاہر ہوتے ہیں۔ مانند شہوت غضب، حرص، حسد، بخل وغیرہ۔ یہ صفات کماہیۃٗ کے معدن سے دوری اور حجاب کے نتائج ہیں۔ پس اس مقام میں انسان قد و قامت کے پیکروں میں حیوان ہی رہتا ہے جس سے مختلف افعال اس کے مختلف خواہشات[2] کے مطابق صادر ہوتے ہیں۔

---

[1] عبد اور رب کے درمیان مقامات: راہِ سلوک میں سالک پر تجلیات کا ظہور صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے۔ جس وقت ایسی تجلّی کا ظہور ہو جائے جس میں وہ اپنے آپ کو فنا کردے تو یہی اس کے سلوک کی انتہا ہے۔ تجلّیات کا ظہور جلد بھی ہو سکتا ہے اور عمر بھر ریاضت کے بعد بالکل آخر میں بھی۔ سلوک کی ابتداء سے مقامِ انتہا تک جو منزلیں آتی ہیں ان کو عبد اور رب کے درمیان مقامات کہا ہے۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس بیان سے رب کی ذات کو محدود کر دیا گیا ہے۔ مفہوم کو سمجھنے کے لیے صوفیاء کے اندازِ بیان کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

[2] مختلف خواہشات: یہاں ہم نے ارادے کا ترجمہ خواہشات کیا ہے۔ یعنی خواہشاتِ نفسانی بندہ جب تک صرف اپنے نفس کے ارادے سے کام کرتا ہے تب تک وہ اپنی نفسانی خواہشات اور شہوات میں مبتلا رہتا ہے اور اسلام اصل میں نام ہے اپنے ارادے کو خدا کے ارادے کے تابع کر دینا ہر امر میں احکامات موجود ہیں۔ مسلمان کسی امر میں بھی اپنے نفس کے ارادے کے تابع نہیں چھوڑا گیا ہے۔ اس لیے جب تک وہ اپنے نفس کو خدا کی مرضی کے تابع نہیں کرتا تب تک وہ اسلام کامل سے دور اور خدا سے حجاب میں ہے۔ اپنے نفس کے ارادے کو ختم کر کے خدا کی مرضی کا تابع ہو جانے کا نام ہی فنا فی اللہ ہے۔

حرفِ اوّل

حضرت سید شاہ محی الدین عبداللطیف رح المعروف بہ قطب ویلور (متوفی ۲۸۹ سنہ ۱ھ) کی شخصیت جنوبی ہند میں آسمانِ ولایت پر ایک درخشاں آفتاب کی ہے۔ ان کی ذات سے ہند سے عرب تک جو فیضان پہنچا اگر ان کی تمام تفصیلات قلمبند کی جائیں تو دفتر کے دفتر تیار ہو جاتے۔ لیکن صوفیا اپنے کارناموں کا ریکارڈ رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت قطب رح ویلور کے وسیع روحانی فیوض کے ساتھ ساتھ ان کے علمی کارنامے بھی امتیازی اہمیت رکھتے ہیں۔ تصوف پر ان کی کتابیں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔ وہ ان مصنفین صوفیار کی صف میں نظر آتے ہیں جو تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مقام پر سمجھے جاتے ہیں۔ تصوف پر بے شمار کتابیں وجود میں آجانے کے بعد حضرت قطب رح ویلور کی تصانیف کا مخصوص امتیازی وصف ان کی ذہانت، معرفت، بصیرت اور گہرے شعور پر واضح طور پر دلالت کرتا ہے۔ ان کی تحریریں حشو و زواید اور غموض سے پاک منطقی انداز میں مربوط، فہم و بصیرت کی حامل اور نظری اعتبار سے نہایت متوازن ہوتی ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ ان کی ہر بات عقل کی میزان پر پوری اترتی ہے۔ پھر اسے قرآن و حدیث اور صوفیار کے اقوال سے مدلّل کرتے ہیں۔ ان کی فہم روشن، دلیل محکم، طرز تحریر مدلّل اور بیان بصیرت افروز ہوتا ہے۔

حضرت قطب رح ویلور کی تصانیف میں ایک جواھر السلوک ہے۔ جس کے گیارھویں فائدے کا ترجمہ قارئین کے پیش نظر ہے۔ اس سے قبل حضرت سیدہ شاہ محمد طاہر قادری المعروف بہ حضرت پیر علیہ الرحمہ کے ایما پر ان کی زندگی میں جناب مولوی سید مصطفیٰ حسین بخاری صاحب، سابق مدرس دارالعلوم لطیفیہ نے دس فوائد کا ترجمہ کیا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ اب اُن کے فعال داماد سیدہ شاہ فصیح پاشاہ قادری (مولیٰ تعالیٰ ان کی عمر کو دراز کرے اور زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت کا اہل بنائے) کی خواہش پر راقم نے اس سال سے اس کا ترجمہ شروع کیا ہے۔

جواھر السلوک میں تصوف کے ضروری مسائل کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مدارس میں اور یونیورسٹیوں میں تصوف کے پرچہ میں درسیات میں داخل کرنے کے قابل ہے۔ اب تصوّف کا ذوق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ عبادت سے روح خارج نظر آتی ہے۔ اس لیے عبادت

میں حلاوت نہیں محسوس ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ نمازوں کا اثر اخلاق پر نہیں مرتب ہو رہا ہے۔ نمازیوں پر بے نمازی خندہ زن نظر آتے ہیں۔ سبب یہی ہے کہ تصوف یعنی احسان کی تعلیم اور اس پر عمل کے ذریعہ کردار کی جو تشکیل ہوتی تھی اب وہ رخصت ہو چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دل مُردہ ہو چکے ہیں۔ جسے پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کیفیت اس وقت حاصل ہوگی جب عبادت کی روح حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ ہم باطن میں بھی نشانیاں دکھاتے ہیں۔ اس کا تجربہ ہوگا۔

بہر حال حضرت قطبؒ ویلور نے کتاب "جواہر السلوک" لکھ کر بہت مفید کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تصوف کے مسائل کو مختصر اور جامع انداز میں سمیٹ دیا ہے۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا ملت کے افراد کا کام ہے۔ اردو ترجمہ کا مقصد یہی ہے تاکہ عام طور پر لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

بیشِ نظر ترجمہ میں جو الفاظ یا جملے قوسین میں ہیں وہ مترجم کی طرف سے ہیں۔ مزید وضاحت اور بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے مترجم نے حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ جہاں حاشیہ مصنف کا ہے وہ صراحت کر دی گئی ہے کہ حاشیۂ مصنف کا ہے۔

جب وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہوتا ہے اور ان لذتوں سے خبردار ہوجاتا ہے جو لذاتِ بہیمیہ سے ماورا ہیں اور آگاہ ہوجاتا ہے کہ ان (سفلیہ) مراتب کے اوپر دوسرے کمالیہ مراتب ہیں تو منکراتِ شرعیہ کے اشغال سے (یعنی غیر شرعی کاموں سے) تائب ہوجاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ توجہِ تام کے ساتھ۔ پھر وہ دنیاوی فضول کاموں کو ترک کر کے اخروی کمالات کی طلب میں راہ پر گامزن ہوجاتا ہے اور عزم کامل اختیار کرتا ہے۔ اور اپنے مقام نفس سے اللہ تعالیٰ کے سلوک کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ اپنے وطن سے ہجرت کرتا ہے اور دیارِ غیر میں وارد ہوتا ہے (رشد کی تلاش میں) مسافر کے لیے کسی رفیق و رہبر کا ہونا ضروری ہے جو اس کی رہ نمائی کرے۔ اس مسافر کا مصاحب توجہ اور علم طریقت ہے۔ اور وہ شیخ ہے۔ (یعنی شیخ کے توجہ اور اس کے علم طریقت کا مرید محتاج ہوتا ہے۔) جب تک یہ مسافر شیخ کا معتقد نہیں ہوگا اس پر کوئی چیز بھی نہیں کھل سکتی اور اس کی صحبت سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے سالک پر واجب ہے کہ اپنے مرشدین کے ساتھ ہمیشہ حسنِ ظن کے ساتھ عقیدت رکھے اور بے شک اس کی صحبت اس کو (اس راہ کی) مہلک چیزوں سے نجات دینے والی ہے اور بے شک وہ اس طریق کا عالم ہے جو سالک کو اس کی (خدا کی) طرف لے جاتا ہے جسے ارادت کہتے ہیں۔ پھر جب وہ مرید ہوگیا تو اس کے لیے لازم ہے کہ شیخ کی اطاعت کرے تاکہ اُسے مقصود حاصل ہوسکے۔ یہاں تک کہ یہ کہا گیا ہے کہ مرید شیخ کے ہاتھوں میں اس طرح ہوتا ہے جیسے غسّال کے ہاتھوں میں میّت۔ جب وہ طریقت میں داخل ہوگیا تو وہ دنیا کے مال اور احوال معیشت میں سے ہر اُس چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اُس کے مقصود کی راہ میں حائل ہو (مثلاً ناجائز تجارت یا تجارت اور پیشہ میں ایسا انہماک کہ فرائض و واجبات چھوٹ جائیں، وغیرہ وغیرہ) اور ان تمام خطرات سے بچتا ہے جو دل میں پیدا ہوکر غیر حق کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور وہ ورع، تقویٰ اور زہد سے متصف ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد (۴) ..... اپنے نفس کو متہم گردانتا ہے۔ خواہ ان احکام کا تعلق عبادت سے ہو (یعنی عبادت کے بعد بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے عبادت کا حق نہ ادا ہوسکا بلکہ اسے کامل حضورِ قلب بھی نہ حاصل ہوسکا۔ وہ صرف اپنی کمی اور کوتاہیوں کو دیکھتا ہے۔ اس طرح اس کے اندر اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس کی نظر اپنی عبادت پر نہیں بلکہ صرف خدا کے فضل پر ہوتی ہے۔) کیوں کہ نفس لذّات و شہوات کی طرف جلد مائل ہوتا ہے اس لیے نفس کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اور اس سے اپنے کو مامون نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ وہ شیطانی مظاہر میں سے ہے۔ جب وہ شیطان کے فریب سے رہائی پاجاتا ہے اور اس کا وقت مصفّیٰ ہوجاتا ہے۔ اور اس کی زندگی اس طرح پاک ہوجاتی ہے کہ وہ اسی میں لذّت محسوس کرتا ہے جو محبوب

---

(۴) وہ ہمیشہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ قول و فعل اور تمام احکام کی تعمیل میں وہ .....

کی پسندیدہ ہے تو اس کا باطن منوّر ہو جاتا ہے اس پر غیب سے انوار کا ظہور ہوتا ہے اور ملکوت کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔ اس پر لمحہ بہ لمحہ تجلّیات کا ظہور ہوتا ہے جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتا اور چھپتا رہتا ہے۔ تب وہ صُوَرِ مثالیہ[1] میں امورِ غیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ان میں سے کسی چیز کا ذائقہ اس نے چکھ لیا تو عزلت، خلوت، ذکر، کامل طہارت، ہمیشہ باوضو رہنے پر مواظبت، عبادت، مراقبہ اور محاسبۂ نفس کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور نفسانی اور حسّی مشاغل سے بالکل اعراض کر لیتا ہے۔ اس کا قلب حسّی لذائذ سے فارغ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے باطن کو حق کی طرف کُلّیتہً متوجہ کر دیتا ہے۔ پس اس پر وجد، سُکر، وجدان، شوق و ذوق، محبت، ہیمان اور عشق کا غلبہ ہوتا ہے۔ جو اُسے یکے بعد دیگرے محو کرتے ہیں۔ اور اس کو اپنے نفس سے فانی کرتے ہیں۔ یعنی بالآخر وہ اپنے نفس سے فنا ہو جاتا ہے۔ (یعنی تمام بشری رذائل اس سے فنا ہو جاتے ہیں۔) اور وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے جن کا تعلق قلب سے ہے اور اسرار کے حقائق اور روح کے انوار سے ہے۔ اب مشاہدہ، معاینہ اور مکاشفہ سے اس پر اشیاء متحقق ہو جاتی ہیں اس پر علم لدنّیہ اور اسرارِ الٰہیہ کا فیض جاری ہوتا ہے۔ اس پر حقیقت کے انوار یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتے ہیں جو کبھی ظاہر ہوتے تھے اور کبھی چھپتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُسے تمکین[2] حاصل ہوتی ہے۔ اسے تلوین سے نجات مل جاتی ہے اور اس پر روحِ سکینہ[3] کا نزول ہوتا ہے۔ اور یہ احوال اس کا ملکہ بن جاتا ہے۔ (یعنی یہ اس کی صفات اس طرح بن جاتے ہیں کہ کبھی زائل نہیں ہوتے۔)

۱۔ صُوَرِ مثالیہ: مثلاً اگر کسی کو نظر آئے کہ اسے دودھ کا پیالہ پلایا جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر علم کا دروازہ کھول دیا گیا ہے یا اگر کوئی بزرگ جسمانی پیکر کے ساتھ نظر آئیں تو یہ مثالی پیکر ہوگا جو حقیقت میں جسم نہ ہوگا بلکہ روح مجسّم ہو جاتی ہے اسے جسمِ مثالی کہتے ہیں۔ یا اُسے کُتّا نظر آیا تو مردہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسکی نفسانی خواہشات بالکل تابع ہیں۔ یہ سب صُوَرِ مثالیہ ہیں۔ اور اس طرح کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

۲۔ تمکین کو مقام بھی کہتے ہیں اور تلوین کو حال۔ دو مقام کے بیچ میں جو کیفیت ہے اُسے حال یا تلوین کہتے ہیں آخری مقام پر پہنچ کر بندہ کامل انسان بن جاتا ہے اب اسے تمکین کامل حاصل ہوتی ہے اور حال یا تلوین سے اُسے نجات مل جاتی ہے لہذا انسانِ کامل کی ایک تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ انسان جو حال یا تلوین سے آزاد ہو کر مقام تمکین حاصل کر چکا ہو۔

۳۔ روحِ سکینہ یا نسبتِ سکینہ کا ذکر شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب "ہمعات" میں تفصیل سے کیا ہے۔ اس نسبت کے ذکر کے بعد حضرت قطبؒ ویلور نے سالک کی جن خصوصیات کا اجمالی ذکر کیا ہے اس کا تعلق بھی نسبت سکینہ سے ہے۔ اس مرتبہ پر سالک کے قلب پر کثرت سے الہام ہوتا ہے۔

تب وہ عالمِ جبروت میں داخل ہوجاتا ہے۔ اور وہ عقول مجردہ، انوار قاہرہ اور ان مدبراتِ کلیہ کا مشاہدہ کرتا ہے جو امور الٰہیہ کو انجام دیتے ہیں۔ جن میں ملائکہ مقربین و مہیمین اور کروبین شامل ہیں۔ وہ ان کے انوار کو دیکھتا ہے پھر اس پر سلطانِ احدیت، سواطعِ عظمت اور کبریائے الٰہیہ کے انوار ظاہر ہوتے ہیں۔ جو اسے ہباً منثورا بنا دیتے ہیں۔ (یعنی جو اُسے خود اُس کی ہستی ہی سے بے خبر کر دیتے ہیں، گویا کہ اس کا وجود فنا ہوگیا۔) اس کی انا کا پہاڑ گر جاتا ہے۔ اور پاش پاش ہوجاتا ہے۔ اب وہ اپنے تعیّن کو تعیّن ذاتی میں تلاش کرتا ہے۔ (اس کو مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں اپنے صحیح مقام یا مرتبہ کو تلاش کرتا ہے۔) تو وہ اپنے عین[1] کو عینِ وجودِ الٰہی پاتا ہے۔ یہ مقام جمع[2] و تفرید و اتحاد و توحید ہے۔ اس مقام میں سالک کی نظر میں غیر مستہلک ہوجاتا ہے۔ (یعنی اُسے صرف حق نظر آتا ہے۔) اور اس کے نور سے تمام پردے جل جاتے ہیں پھر وہ پکارتا ہے لمن الملک الیوم۔ پھر وہ اپنے ہی نفس سے اپنے نفس کو جواب دیتا ہے للہ الواحد القہار

---

[1] عین بندے کا عین اس کی وہ صورتِ علمی ہے جو خدا کے علم میں ازل سے ہے یعنی خدا نے اپنے علم کے مطابق بندے کو ظاہری وجود بخشا۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں ظاہری وجود سے پہلے بھی بندے کا وجود خدا کے علم کی صورت میں تھا اسی صورتِ علمیہ کو بندے کا عین کہتے ہیں۔ بندے کا عین خود خدا کے اندر ہے یعنی خود خدا کے وجود میں ہے۔ صوفیاء کی اس بات کو اگر نہ مانا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ نعوذ باللہ بندے کے ظاہری وجود سے پہلے خدا اس کے وجود کے علم سے بے خبر تھا اسی طرح خدا پر جہل کا الزام عاید ہوگا جو ناممکن ہے کیوں کہ جہل عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ خدا کے علم میں بندے کا وجود ازل سے علمی صورت میں تھا۔ ابن عربی نے اسے صُوَرِ علمیہ کا نام اعیانِ ثابتہ رکھا ہے۔

[2] مقامِ جمع اس لیے ہے کہ اس مقام پر بندے کی استعداد کے مطابق خدا کا فضل اور فیضان اس پر نازل ہوتا ہے۔ تفرید اس لیے ہے کہ اس مقام پر وہ تمام عالم سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ اتحاد اس لیے کہ اس مقام پر اس کو اپنے وجود کی خبر نہیں ہوتی اور صرف حق کا وجود باقی رہتا ہے اسی کو وصل بھی کہتے ہیں۔ بعض علمائے ظاہر نے اتحاد کا مطلب حلول سمجھ لیا ہے۔ اور اس لیے صوفیاء پر الزام لگا دیا۔ یہ صرف صوفیاء کی اصطلاح ہے ورنہ حقیقت میں نہ اتحاد ہوتا ہے نہ وصل بلکہ چوں کہ اپنے وجود کا شعور ہی نہیں رہ جاتا اس لیے اس مقام کا نام وصل یا اتحاد رکھ دیا۔ یہ حالت بھی صرف لمحاتی ہوتی ہے اور جب بندہ شعور میں آتا ہے تو وہ کیفیت جاتی رہتی ہے لیکن اب وہ تلوین یا حال کی طرف نہیں لوٹتا کیوں کہ اس سے آزاد ہوچکا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف خود حافظ شیرازی نے یوں اشارہ کیا ہے ؎

غلام ہمّت آنم کہ زیر چرخ کبود — ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

مقامِ توحید اسی لیے ہے کہ سالک کو یہاں ادراک ہوتا ہے کہ وجود میں خدا کا کوئی شریک نہیں اور وجود صرف خدا کا ہے۔ مراتبِ توحید پر راقم کی کتاب 'تصوف' میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

یہ سلوک کے چار سفروں میں سے پہلے سفر کا بیان ہے جو سالکین اور کاملین کے لیے اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو واصلین اور فائزین کا مقام عطا فرمائے۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ قدوۃ الاولیاء شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی نے کتاب "منازل السائرین" میں سلوک کے سفر اول میں ایک سو مقامات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ہر مقام میں دس منزلیں ہیں۔ اس طرح سلوک کے ایک ہزار مقامات ہوتے ہیں۔ جس کی طرف داؤد قیصری نے اشارہ کیا ہے۔ ان ہزار مقامات[1] کا ذکر زبدۃ العرفاء شیخ کمال الدین عبدالرزاق کاشی نے کتاب "اصطلاحات صوفیاء" کی قسم ثانی میں کیا ہے۔ ان کو خداوند تعالیٰ ہماری طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے۔ فقیر نے (یعنی حضرت قطب دہلوی نے) آسانی سے سمجھنے کے خیال سے ان ہزار مقامات کو جداول میں لکھا ہے۔ جو اس کتاب کے آخر میں ہے۔

نیز جاننا چاہیے کہ شیخ الشیوخ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے کتاب "مناہج الارتقا" میں سلوک کے سفر اول میں تین ہزار منزلوں کا ذکر کیا ہے جیسا کہ "فتوحات مکیہ" کے ۱۶۷ ویں باب میں فرماتے ہیں۔ اس میں سے ہروی شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی نے ایک جزو کا ذکر اپنی کتاب "منازل السائرین" میں کیا ہے جو ایک سو مقامات پر مشتمل ہے۔ ہر مقام پر دس مقامات ہیں اور یہ منزلیں ہیں۔ اور ہم نے ان منازل کا ذکر ایک کتاب میں کیا ہے جس کا نام "مناہج الارتقا" رکھا ہے جو تین سو مقامات پر مشتمل ہے۔ ہر مقام میں دس منزلیں ہیں اس طرح تین ہزار منزلیں ہوئیں۔

اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ شیخ المشائخ شیخ نجم الدین کبریٰ نے اپنے رسالہ "عشرۃ الوصول" میں سلوک کے سفر اول میں دس مقامات کا ذکر کیا ہے۔ اول: توبہ، دوم: زہد، سوم: توکل، چہارم: قناعت، پنجم: عزلت، ششم: ملازمت ذکر، ہفتم: توجہ الی اللہ، ہشتم: صبر، نہم: مراقبہ، دہم: رضا۔ اور مولانا عبدالغفور لاری نے اس رسالہ کی شرح لکھی ہے۔ اور ان دس مقامات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس میں دیکھنا چاہیے۔ ایک روشن دل آدمی ان دس مقامات سے مزید مقامات کا استنباط کر سکتا ہے۔ ••

---

[1] [حاشیہ مصنف] یہ ہزار مقامات ابوبکر کتانی کے قول کی شرح ہے جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ عبد اور حق کے درمیان نور و ظلمت کے ہزار مقامات ہیں جیسا کہ ہروی نے "منازل السائرین" میں لکھا ہے اور کتانی صوفیا کے چوتھے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا نام محمد بن علی بن جعفر بغدادی کتانی ہے۔ جنید کے اصحاب میں تھے برسوں تک مکہ میں مجاورت کرتے رہے اور وہیں ۳۲۲ ہجری میں وفات پائی۔

مولوی
محمد رمضان القادری کلیانی پوری
فاضل جامعہ فاروقیہ بنارس (یوپی)
استاذ
دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان
ویلور
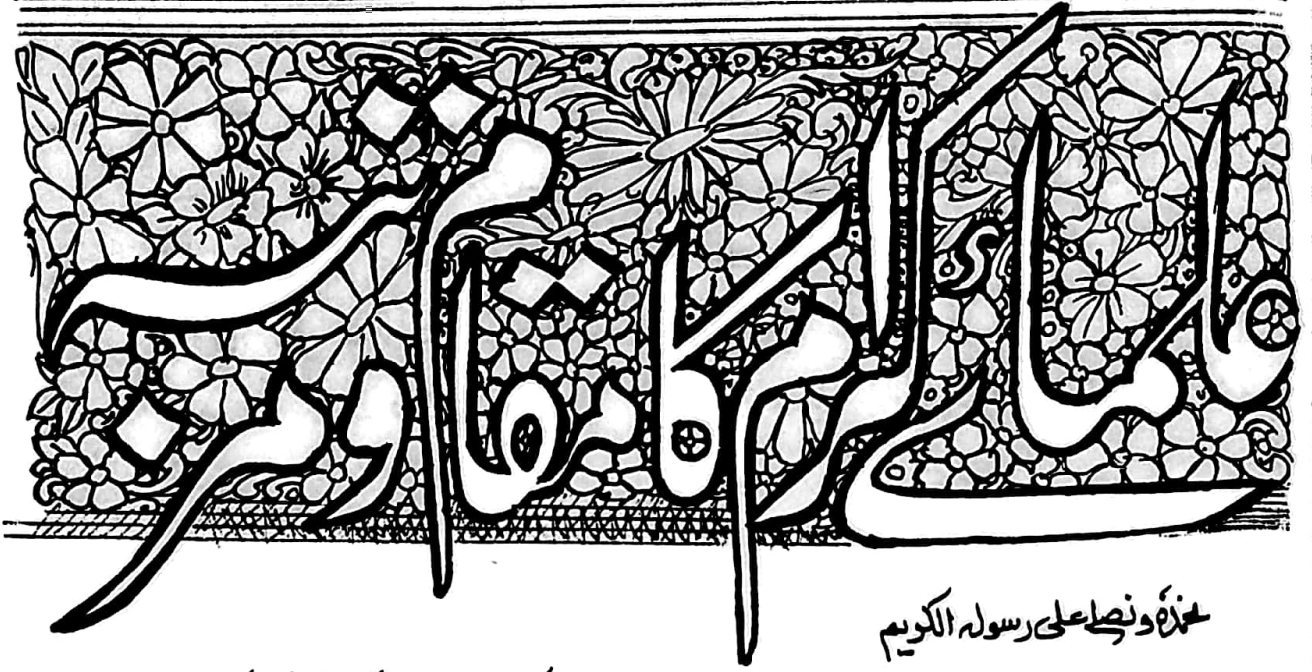
نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد!

پروردگار عالم نے اپنا آفاقی پیغام حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنے بندوں تک پہنچا کر سیدھی راہ بتلائی، اس پیغام کی ایک کڑی طلبِ علمِ دین بھی ہے جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان خواہ مرد ہو یا عورت ضروری ہے۔ اور اتنا علمِ دین سیکھنا فرض ہے جو کہ ضروریات دین سے متعلق ہو۔

ارشاد ربانی ہے:

ماکان المؤمنین لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ مسلمانوں کو زیبا نہیں کہ سب کے سب باہر جاویں پس کیوں نہیں ہر فرقہ میں سے ایک ٹکڑا جاتا تاکہ فقہ دین حاصل کرے اور عذاب الٰہی کا ڈر سنائے اپنی قوم کو جب وہ لوٹ کر آئیں اُن کے پاس اس امید سے کہ سب اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے پرہیز کریں۔

اس آیتِ کریمہ کی رُو سے مسلمانوں کا باہر جانا فرض قرار دیا گیا، خواہ جہاد کے لیے ہو یا علمِ دین سیکھنے کے لیے۔ جہاد میں بھی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم علم دین سیکھا کرتے تھے۔

چوں کہ قرآن مجید کے نزول کا زمانہ تھا اللہ تعالیٰ بعض مسلمانوں پر باہر جا کر علم دین سیکھنا فرض قرار دیا اور جب یہ علماء اپنی قوم کی طرف لوٹ آئیں توان کی اقتدار اور تقلید کو فرض قرار دیا گیا۔ یعنی یہ علماء جو مسائل شرعیہ لوگوں کو بتائیں اور سمجھائیں تو ان پر ان کا عمل کرنا فرض ہوا۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے:

عن معاویۃ قال قال رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم مَنْ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یفقھہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُسے دین کا عالم بنا دیتا ہے اور میں تو تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ دیتا رہتا ہے۔

مذکورہ حدیث شریف سے علم دین کی فضیلت علمائے دین کی محبوبیت، حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاسم ہونا اور اللہ کا معطی ہونا ثابت ہوا۔

ایک اور آیت کریمہ ہے:

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون: یعنی پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں ہے اہل ذکر سے مراد مجتہدین عظام ہیں، جو قرآن و حدیث کے ماہر اور جاننے والے ہیں۔

قرآن شریف میں جابجا علماء کو ترغیب دی گئی ہے کہ علم دین حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور جب اپنے وطن کی طرف لوٹ کر آئیں جیسا کہ یہ آیت کریمہ شاہد ہے ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون ڈرائیں اپنی قوم کو جب وہ ان کی طرف لوٹ آئیں تاکہ وہ بچتے رہیں۔ وہ علماء جب علم حاصل کرکے اپنی قوم اور اپنے وطن کو لوٹ آئیں تو لوگوں کو علم دین کی تعلیم دیں گے۔ اللہ کے قہر و عذاب سے ڈرائیں گے، اللہ کی عبادت کی ترغیب دیں گے۔ اس طرح علماء پر لوگوں کو علم دین اور تبلیغ کرنا فرض ہوا۔

واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتب لتبیننہ للناس ولا تکتمونہ

اللہ پاک نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی وعدہ لیا کہ لوگوں میں اس کو بیان کریں۔ اور نہ چھپائیں اس کو لوگوں سے۔

اس آیت کریمہ میں لوگوں کو علم دین سکھانا اور اس کا فرض ہونا مذکور ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:

وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون۔ بے شک ایک فرقہ جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں پروردگار عالم نے علم دین چھپانے کی حرمت بیان فرمائی ہے۔ ایک اور جگہ ہے:

ومن یکتمھا فانہ آثم قلبہ

اور جو شخص شہادت کو چھپائے، بے شک اس کا دل گنہ گار ہے۔ اور فرمایا:

مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وعمل صالحًا: اس سے بہتر قول کس کا ہوسکتا ہے جس نے بلایا اللہ کی طرف اور نیک کام کیا۔

اُدع الٰی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ: بلاؤ لوگوں کو اپنے رب کی طرف حکمت اور نصیحت کے ساتھ۔

اور فرمایا: ویعلمھم الکتاب والحکمۃ:
یعنی سکھا اُن کو کتاب اور عقل مندی۔

اسی طرح احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی علماء کو تعلیماتِ نبوی کی اشاعت و ترویج کی ترغیب دی گئی ہے۔

فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کسی کو عالم بنایا تو اس سے وعدہ بھی لیا ہے جو نبیوں سے لیا ہے کہ اس کو لوگوں میں بیان کرو۔ اور نہ چھپاؤ۔ (ابونعیم) نیز فرمایا: العلماء ورثۃ الانبیاء۔ علماء انبیاء کے وارث ہوا کرتے ہیں۔

حضور سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا: لان یھدی اللہ بك رجلا واحداً خیرٌ لك من الدنیا وما فیھا:
(مسند امام احمد) اور بخاری و مسلم نے بھی یہی مضمون حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے متعلق روایت کیا ہے۔)

اگر تیرے سبب سے خدائے تعالیٰ ایک آدمی کو بھی ہدایت کرے تو یہ تیرے حق میں دنیا اور اس کے درمیان کے چیزوں سے بہتر ہے۔ نیز ارشاد فرمایا:

جو شخص علم کے ایک ایک باب کو اس لیے سیکھے کہ لوگوں کو سکھائے تو اُس کو ستر نبیوں کا صدیقوں کا ثواب دیا جائے گا۔

نیز فرمایا:

ایک عالم دین ہزار عابدوں سے بھاری ہے

نیز فرمایا:

جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ عبادت کرنے والوں سے ارشاد فرمائے گا کہ جنت میں جاؤ علماء عرض کریں گے کہ الٰہی انہوں نے ہمارے طفیل علم حاصل کیا اور عبادت و جہاد کیا یعنی شایانِ اکرام تو ہم ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم میرے نزدیک بعض فرشتوں کے مثل ہو۔ تم شفاعت کرو تمہاری شفاعت منظور ہوگی۔ پس وہ سفارش کریں گے، پھر جنت میں داخل ہوں گے۔ اور یہ رتبہ اس علم کا ہے جس کے علم سے دوسرے اشخاص مستفیض ہوں گے نہ کہ وہ علم جس کا دائرہ اسی شخص تک محدود ہو۔

ایک اور حدیثِ شریف میں ہے:

ان اللہ عزوجل لاینزع العلم انتزاعاً من الناس بعد ان یوتیھم ایاہ ولکن یذھب بذھاب العلماء ذھب عالم ذھب بما معہ من العلم حتی اذا لم یبق الا رؤساً جھالاً ان سئلوا افتوا بغیر علم فیضلون و یضلون: (بخاری مسلم)
پروردگار عالم لوگوں سے علم چھین نہیں لیتا۔ مگر علماء کو لے جانے سے چلا جاتا ہے۔ پس جب کوئی عالم چلا جاتا ہے تو اس کے ساتھ علم بھی چلا جاتا ہے یہاں تک بجز جاہل سرداروں کے اور کوئی نہیں رہتا۔

اوران سے لوگ فتویٰ پوچھتے ہیں تو بے علمی سے فتویٰ دیتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

الدال الخیر کفاعلیہ : نیک کام بتانے والا نیک کام کرنے والے کے برابر ہے۔ لا یحسد الا فی اثنین رجل آتاہ اللہ عزوجل حکمۃ فھو لیقضی بھا ویعلمھم الناس ورجل آتاہ اللہ مالاً فسلطہٗ علیٰ لتھلکۃ فی الخیر۔

ترمذی و مسلم

دو شخصوں پر حسد کیا جاتا ہے۔ ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت عطا کیا ہے اور وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہو۔ دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے اور اس کو نیک کاموں میں خرچ کرتا ہو۔

اور فرمایا:

میرے نائبوں پر خدا کی رحمت ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ کے نائب کون ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: کہ وہ لوگ جو میرے طریقے کو پسند کرتے ہیں اور خدا کے بندوں کو سکھاتے ہیں۔ من علم علماً فکتمہ الجمۃ اللہ یوم القیامۃ بلجام من النار۔ یعنی کوئی شخص علم سیکھے اور اس کو چھپائے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو آگ کی لگام دے گا۔

اور فرمایا: عمدہ ھدیہ کلمۂ حکمت ہے۔ جس کو تو سُنے اور یاد رکھے پھر اس کو اپنے مسلمان بھائی کے پاس لے جائے اور اُس کو سکھائے تو ایک سال کی عبادت کے برابر ہے۔

ایک دفعہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے حضرت جبرئیلؑ امین سے پوچھا کہ سب سے بڑا جہاد کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کہ علم دین حاصل کرنا اس کے بعد علماء کی خدمت کرنا، اس کے بعد علماء کی زیارت کرنا۔ اگر کوئی شخص عالم کی ایک دن خدمت کیا اس کو سات سو سال نیکی کمانے کا ثواب ملے گا۔ اور جب کوئی بندہ علم دین حاصل کرنے کے لیے نکلتا ہے تو جب تک وہ علم دین حاصل کرتا رہتا ہے اس وقت تک فرشتے اپنے پروں میں رکھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر کوئی طالب علم اسی راہ میں مرگیا تو وہ شہادت کا مرتبہ پاتا ہے۔ اور ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ دنیا کے سارے لوگ علماء کے محتاج ہوتے ہیں۔ طالب علم چاندی کے مانند ہے اور عالم سونے کی مانند اور علم انبیاء کی وراثت ہے۔ مال فرعون اور قارون کی وراثت ہے۔

علم صاحب علم کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن مال کو صاحب مال کو حفاظت کرنا پڑتا ہے۔

قرآن شریف میں ہے:

ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون

یعنی جاہل اور عالم برابر نہیں ہوتے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے بخوبی واضح ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ شیطان اپنا مصنوعی لبادہ اوڑھ کر ایک عالم دین کے پاس جا کر کہتا ہے میں جبرئیل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں اللہ کی رضا مندی کی خوش خبری سنادوں۔ اتنا سننا تھا کہ عالم دین نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ شیطان ہے اسی وقت لاحول ولاقوۃ کا نعرہ بلند کیا۔ شیطان وہاں سے اپنا اصلی چہرہ بتلا کر بھاگ نکلا۔ اسی طرح ایک جاہل عابد کے پاس آکر کہتا ہے کہ میں جبرئیل امین ہوں اللہ تعالیٰ نے تیری عبادت کو قبول فرمالیا ہے اور وہ اب تجھے معراج کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا اب تم معراج کی تیاری کرلو۔ چناں چہ یہ بے چارے جنھیں اپنی عبادت پہ ناز تھا بہت خوش ہوئے۔ خوشی و مسرت میں جھومتے ہوئے شیطان کے پاس تشریف لائے شیطان نے انھیں معراج کی تیاری اس انداز میں کرا رہا تھا۔ سب سے پہلے عابد صاحب کی آنکھوں پہ پٹی باندھا، پھر چہرے کو کالے رنگ سے رنگ کر گدھے پہ بٹھایا اور سارے شہر میں گھما کر علی الصباح ایک دیہات کی مسجد کے پاس چھوڑ کہا کہ دیکھو یہ عرش ہے۔ بوڑھے، بچے، مصلی حضرات سب مذاق اڑانے لگے۔ عابد صاحب ندامت سے سر جھکائے ہوئے فوراً اپنے گھر گئے۔ اور غسل کیا اور سوچا کہ کسی عالم دین کے پاس جانا چاہیے اور علم دین سیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد عبادت میں مشغول و مصروف ہونا چاہیے۔ علم حاصل کرنے کے بعد وہ شریعت کے مطابق اپنی عبادت کا مظاہرہ کرنے لگے جس کے نتیجے میں شیطان آپ سے پناہ مانگنے لگا

ایک حدیث شریف میں ہے کہ:
رات میں تھوڑی دیر علم نبوی پڑھ کر سو جانا رات بھر عبادت میں مصروف رہنے سے بہتر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں طالب تھا تو بے وقار تھا۔ اب جو میرے پاس لوگ سیکھنے لگے تو میں عزت والا ہو گیا۔

اور اسی طرح حضرت ابن ملیکہ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مثل میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ صورت کو دیکھو تو سب سے اچھی۔ اگر گفتگو کریں تو سب سے فصیح اور فتویٰ دیں تو سب سے زیادہ علم والے معلوم ہوتے ہیں

ابن مبارک فرماتے ہیں کہ مجھ کو تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جو علم کا طالب نہ ہو۔

بعض حکماء کا قول ہے کہ ہم کو جتنا دو شخصوں پہ ترس آتا ہے اور کسی پہ نہیں آتا۔ ایک اس شخص پہ جو علم طلب کرتا ہے لیکن سمجھتا نہیں ہے اور دوسرا وہ شخص جو علم سمجھتا ہے مگر اس کی طلب نہیں کرتا۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

اگر میں ایک مسئلہ سیکھوں تو میرے نزدیک تمام رات کی شب بیداری سے اچھا ہے اور انھیں کا یہ بھی قول ہے کہ عالم اور طالب علم خیر میں شریک ہیں اور دوسرے لوگ بے سود ہیں۔ اور یہ بھی انھیں کا قول ہے کہ عالم ہو یا طالب علم یا سننے والا ان تین کے سوا جوتھا مت ہو۔ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم کا طلب کرنا نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس کی یہ تجویز ہو کہ طلب علم جہاد نہیں وہ اپنی عقل اور تجویز میں ناقص ہے۔

مسلم شریف میں ہے:

اذا مات ابن آدم انقطع عملہٗ الا من ثلث علم ینتفع بہ او صدقۃ جاریۃ او ولدٌ صالح یدعو الہ بالخیر۔ آدمی جب مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزیں باقی رہتی ہیں۔ ایک وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ دوسری چیز صدقہ جاریہ اور تیسری چیز اولاد صالح جو ماں باپ کے لیے دعائے خیر کرے۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ زندوں کی طرف سے مُردوں کو نفع اور ثواب پہنچتا ہے ورنہ ترغیب دلانے سے کیا فائدہ؟

بلکہ اس کے بارے میں نص صریح ہے۔

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے:

حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس نے کچھ وصیت نہیں کی ان کے لیے کون سا صدقہ بہتر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الماء یعنی پانی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کنواں کھدوایا اور فرمایا: ھٰذِہٖ لِاُمِّ سَعْدٍ: یہ کنواں سعد کی ماں کے لیے ہے۔ یہ کنواں مدینۂ طیبہ میں بہت دنوں تک موجود تھا اور ایک زمانہ تک اس کنویں کا پانی صحابہ اور تابعین نوش فرماتے رہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کوئی حدیث بیان کرے اور اس پر عمل کرے تو اس کا ثواب ان لوگوں کو برابر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کو بہتر بات سکھاتا ہے تو اس کے لیے تمام چیزیں یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں تک استغفار کرتی ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ عسقلان تشریف لائے۔ کچھ دن وہاں رہے ان سے کسی نے کچھ پوچھا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے لیے سواری لاؤ، میں اس شہر سے نکل جاؤں

چاہتا ہوں ۔ یہ ایسا شہر ہے جس میں علم مر جائے گا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر علماء نہ ہوتے تو آدمی چوپائے کے مثل ہو جاتے۔

یحییٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ علماء امت پر ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں ۔ لوگوں نے پوچھا کہ کس طرح؟ آپ نے فرمایا کہ ماں باپ بچوں کو دنیاوی آگ سے بچاتے ہیں، اور علماء آخرت کی آگ سے بچاتے ہیں ۔ جو زیادہ سخت اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ علم سیکھو اس لیے کہ علم کا سیکھنا خوفِ الٰہی ہے، اس کی جستجو عبادت ہے اور اس کا درس دینا تسبیح ہے ۔ اس کی بحث جہاد ہے اور جو شخص نہ جانتا ہو اس کو تعلیم دینا خیرات ہے اور جو اس کا اہل ہو اس پر خرچ کرنا قربِ منزلت ہے ۔ یہی علم تنہائی میں انیس ہے، سفر میں جلیس ہے، خلوت میں گفتگو کرنے والا ہے ۔ دین کا راہ نما ہے، حالتِ تونگری اور افلاس میں چراغ ہے، دشمنوں کے حق میں ہتھیار ہے ۔ اور اسی علم کی بدولت اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو بلند مراتب اور درجات عنایت فرماتا ہے ۔ کہ ان کو امر خیر میں سردار پیشوا اور ہادی بناتا ہے ۔ ان کے نقوشِ قدم پر لوگ چلتے ہیں ۔ ان کے افعال کو لوگ تاکتے ہیں ۔ فرشتے ان کی درستی میں رہتے ہیں ۔ یہاں تک کہ آسمان و زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب ان کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہیں ۔ علم دل کی زندگی ہے اور جہالت تاریکی ہے وہ باقی نہیں رہتی ۔ علم امام ہے اور عمل اس کے تابع ہے ۔ نیک بختوں کے دل میں اس کی جگہ ہوتی ہے اور بدبخت اس سے محروم رہتے ہیں۔

حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اختلاف امتی رحمۃ ۔ میری امت کا اختلاف باعثِ رحمت ہے ۔ اختلاف امتی سے مراد ائمہ اربعہ اور دیگر مجتہدین کے اختلاف ہیں ۔ اس لیے کہ اس اختلاف سے مشکل مسائل حل ہو گئے ۔ بہت سی دقیق باتیں جن کو کم فہم کم علم سمجھنے سے قاصر تھے ان کے لیے آسان ہو گئیں مجتہدین نے قرآن و احادیث کی روشنی میں قواعد مقرر کئے ۔ اور ان پر جزئیات متفرع کئے اور لوگوں کو جن مسائل کی ضرورت تھی ان سے متعلق احکام مستنبط کئے۔

مسندِ خوارزمی میں سیف الائمہ سے منقول ہے کہ یہ بات مشہور ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے چار ہزار علماء اور تابعین کو درس دیا لیکن محض اپنے علم سے فتویٰ نہیں دیتے تھے ۔ کوفہ کی جامع مسجد میں بیٹھتے اور ہزاروں شاگرد امام صاحب کے جمع ہوتے ان میں بزرگ تر اور فاضل تر چالیس شاگرد ہوتے جو رتبۂ اجتہاد کو پہنچے تھے ۔ (بقیہ صفحہ ۱۹ پر ملاحظہ ہو)

ٹیپو سلطان شہید کی زندگی کا ایک مختصر جائزہ

● مولوی پی محی الدین باشاہ بی کوتہ کوٹہ جماعتِ مولوی عالم، دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

سنہ 1707ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ پارہ پارہ ہوگئی اور تمام ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اور انگریزوں کا منحوس سایہ ہندوستان پر منڈلانے لگا۔ ان کا مقصد صرف یہی تھا کہ بھائیوں بھائیوں کو لڑاکر، حکمرانوں میں پھوٹ ڈلواکر حکومتوں پر قبضہ جمائیں ایسے وقت میں ایک مردِ مجاہد عادل کی سخت ضرورت تھی۔ چناں چہ ایسے افتراق انگیز زمانہ میں ایک ایسی ہستی وجود میں آئی جس کی رگوں میں سپہ گرانہ خون دوڑ رہا تھا وہ ابوالفتح ٹیپو سلطان ابنِ حیدر علی ہیں۔ جو اپنی بہادری اور استقلال، اولوالعزمی اور عزم بالجزم سے تمام فسادات و قتل و غارت گری کو ختم کرتے ہوئے تاج و تخت کے مرتبۂ بلند تک پہنچے۔ اور آپ کی دانش مندی و جنگی تدابیر اور آپ کی شمشیر آبدار نے ایک طرف اگر مرہٹے، نظام حیدرآباد کے قصرِ بادشاہی میں زلزلے ڈال دئے تو دوسری طرف نوابِ کرناٹک اور انگریزوں کے گھروں میں بھی صفِ ماتم بچھادی۔

پیدائش

آپ کی ولادت سنہ 1163ھ مطابق سنہ 1752ء ۲۰ ماہ ذی الحجہ روز شنبہ کی پہلی ساعت میں ہوئی ٹیپو کے والد کا نام حیدر علی اور والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ مقام پیدائش دیون ہلّی ہے جو بنگلور سے شمال مشرق کی طرف تقریباً بائیس 22 میل پر ایک قریہ ہے۔

بچپن

جس وقت آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو عربی اور فارسی

کی تعلیم کے علاوہ امور سپہ گری اور شہ سواری سکھانے کے لیے بڑے بڑے مشہور استاد رکھے گئے۔ سلطان نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود کو ایک لائق شہزادہ اور بہادر سپاہی ظاہر کیا۔ اور باپ کے ساتھ لڑائیوں میں شامل ہونے لگے۔ اس کے بعد باپ کے حکم سے بطور خود میدانِ کارزار میں جا کر طریقۂ جنگ سے کامل واقفیت حاصل کی۔

بچپن کے حالات میں سب سے زیادہ دل چسپ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ جب سلطان ٹیپو کی عمر چھ یا سات سال کی تھی تو آپ سرنگا پٹم میں اس جگہ جہاں اب مسجد اعلیٰ ہے کھیل رہے تھے کہ ایک فقیر روشن ضمیر کا گزر ہوا۔ اس فقیر نے سلطان کو دیکھ کر کہا: تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے اس ملک کا حکمران بنائے گی اور جب وہ وقت آئے گا تو اس جگہ ایک ایسی مسجد تعمیر کر جو زمانہ میں تیری یادگار رہے۔

سلطان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ جب وہ بادشاہ بنے گا تو ضرور ایسا ہی کرے گا۔

اس وقت حیدر علی بیسور کے راجہ کی ملازمت میں نائک کے عہدے پر تھے اور زیرِ عتاب تھے۔ اور اپنی آخری بازی میدانِ جنگ میں کھانڈے راؤ سے کھیل رہے تھے۔

چناں چہ دنیا نے دیکھ لیا کہ فقیر کی پیشین گوئی حرف بہ حرف سچ ہوی۔ اور سلطان کس خوبی سے اپنا وعدہ پورا کیا۔

جوانی اور ایام ولی عہدی

سلطان ٹیپو کی عمر پندرہ سال تھی۔ اپنے نامور شجیع باپ حیدر علی خان بہادر کے ساتھ رہ کر فنونِ جنگ کی عملی تعلیم حاصل کی یہاں تک کہ دو سال کے قلیل عرصہ میں وہ اپنی خداداد قابلیت سے ایک عظیم سپاہی اور لائق و فائق جنرل اور فاضل اہل قلم بن گئے۔

یہاں تک کہ فوجوں کی علاحدہ کمان آپ کے تفویض کر دی گئی۔

انگریزوں سے پہلی جنگ

اس جنگ کا آغاز ۱۷۶۷ء میں ہوا۔ اس وقت سلطان ٹیپو کی عمر ۱۶ سال تھی۔ اس جنگ میں نواب حیدر علی خان بہادر نے اپنے لائق فرزند سلطان کو سات ہزار کی جرار فوج کو دے کر نگری کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ سلطان نے بندرگاہ کوڑیال پہنچ کر انگریزی فوج کو دیکھا اور اندازہ کر لیا کہ وہ اپنی سات ہزار کی فوج سے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے آپ نے ایک طویل مراسلہ والد کی خدمت میں مزید کمک کے لیے بھیجا۔ حیدر علی بذاتِ خود ایک بہت بڑی کمک لے کر آن پہنچے اور سلطان کو قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سلطان نے قلعہ فتح کر لیا۔ انگریزی سپہ سالار شکست کھا کر ساحل کی طرف اپنی فوج کے ساتھ چلا گیا۔ اور وہاں سے جہاز

میں سوار ہوکر چلا گیا۔ اس نمایاں کامیابی پہ باپ نے بیٹے کی بہت تعریف کی۔ اس جنگ میں جب کہ نظام مرہٹے اور انگریز مل کر مختلف محاذ پر حملے کر رہے تھے تو نواب حیدر علی نے فوج دے کر ٹیپو سلطان کو مدراس پہ حملہ کرنے کے لیے بھیجا ٹیپو سلطان کا دھاوا ایسی عجلت اور سختی سے ہوا کہ انگریز سراسیمہ اور پریشان ہوکر نواب حیدر علی کی پیش کردہ شرائط پر صلح کرنے پہ مجبور ہو گئے۔ اسی سال کڑپہ، کرنول، بلاری، اناگندی، اور دھاڑوار پہ لشکر کشی ہوی۔ اور بہ حیثیت سپہ سالار نوجوان شہزادہ ٹیپو نے ان سب میں حصہ لیا جہاں جاتے تھے فتح وظفر مندی ان کے ہمرکاب رہتی تھی۔

شادی

جب ان لڑائیوں سے فرصت ہوی اور نواب حیدر علی خاں منظفر ومنصور سرنگاپٹم واپس آئے تو مناسب جانا کہ ٹیپو سلطان کی شادی کر دی جائے۔ چناں چہ 1774ء میں ٹیپو سلطان کی شادی حسب مرضی نواب حیدر علی خان وخواتین محل، امام صاحب بخشی نوائط کی لڑکی رقیہ بانو سے ہوی۔

ٹیپو سلطان کی تخت نشینی

حیدر علی کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے ۲۵ محرم الحرام ۱۱۹۷ھ 1782ء روز یکشنبہ کو تاج شاہی پہنا اور ارکانِ دولت کو خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کیا۔ اور فوج کو انعام دیا گیا محفل جشن آراستہ ہوئی۔ امرائے دولت اور اعیان سلطنت نے نذریں پیش کیں۔ تخت نشینی کے بعد تمام ملک کے ناظموں، قلعداروں اور افسران فوج کو پروانے لکھے گئے کہ جو جہاں ہے اپنا فرضِ منصبی نہایت خوبی اور اطمینان سے ادا کرتا رہے۔ میر صادق دیوان اور پورنیا وزیر بدستور مقرر ہوئے۔

مجلسِ وطنی

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ ٹیپو سلطان نے اپنی سلطنت کے انتظام میں رعایا کو حصہ دینے کے لیے پارلیمنٹ یا مجلسِ وطنی بھی قائم کی تھی۔ اور اس مجلس کا نام "زمرۂ غم نباشد" تھا۔ اس سے سلطان کی مراد یہ تھی کہ شخصی اقتدار کا خاتمہ کرتے ہوئے ملک کی زمامِ حکومت رعایا کے ہاتھ میں دے دی جائے اور بادشاہ ایک کانسٹی ٹیوشنل (آئینی حکمران) رہے۔

اس مجلس کو زمرۂ غم نباشد نام دینے سے ان کی مراد یہ تھی کہ سلطنت کو کسی طرح کا اندرونی خطرہ باقی نہ رہے گا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت ملک اس قدر ترقی یافتہ نہیں تھا کہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

مگر اس مجلس کے قیام سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے دل میں جمہوریت اور مساوات کا کس قدر احساس تھا۔ اس سلسلہ

میں کرنل ولکن اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے:

"جمہوریت جس کی اُس وقت فرانس میں دھوم تھی وہ یہاں ٹیپو کے پاس کوئی نئی یا تعجب خیز بات نہ تھی۔ آپ نے ہر شخص کو مساوات دے رکھی تھی۔"

حلیہ

صاحبِ "نشانِ حیدری" بیان کرتے ہیں۔ حضرت ٹیپو سلطانؒ گندمی رنگ کے تھے، آپ کی ناک خم دار، آنکھیں پُر آب اور بڑی بڑی تھیں۔ گردن پر بَل پڑتے تھے۔ قد پانچ فٹ اور آٹھ انچ تھا اور چہرہ پُر رعب تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عام آدمیوں سے آپ کی ذات بالاتر ہے

حضرت ٹیپو سلطان بالکل سادہ اور شرعی لباس پہنتے تھے۔ اپنی دستار اور ٹھوڑی کے نیچے سفید رومال باندھتے تھے۔ کمر کی پیٹی میں ایک پیش قبض اور تلوار رہتی تھی۔ گھوڑے کی سواری بہت پسند کرتے تھے۔ پالکی اور اس قسم کی سواری سے آپ کو نفرت تھی۔

طرزِ گفتگو اور زبان

حضرت ٹیپو سلطان کا طرز گفتگو بالکل ملائم اور شیریں تھا۔ حضرت ٹیپو سلطان کی زبان سے کبھی کوئی فحش کلمہ نہیں نکلتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے حضرت ٹیپو سلطان زیادہ تر فارسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ آپ کو کنڑی اور دکھنی زبان پر بھی کامل عبور تھا۔

سادگی

مسلمانوں کے اختلال کو دیکھتے ہوئے ٹیپو سلطان معلوم کر چکے تھے کہ جب تک مسلمان عجم و ہند کے خصائص جو اُن میں سرایت کر گئے ہیں نہ چھوڑیں گے اور جب تک زمانہ خیر القرون کی سادہ زندگی اختیار نہ کریں وہ دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لیے آپ نے تمام تکلفات کو برطرف کر دیا۔ نشست برخاست، آداب و سلام اور تحریر و تقریر میں جو سادگی آپ نے اختیار کی وہ آپ اپنا نمونہ ہے۔ اس سے پہلے یعنی مغلیہ حکومت کے زمانے میں آداب و سلام کے طریقوں میں کئی کئی بار جھک کر بلکہ زمین بوس ہو کر سلام کیا جاتا تھا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا تو ایک معمولی بات تھی۔ یہاں تک کہ مساجد میں بھی امیروں کی تعظیم و تکریم شروع ہو گئی تھی۔

آپ نے اس قسم کے تمام تکلفات کو ختم کر دیا اور اپنے لیے کسی قسم کے امتیازات کو روا نہ رکھا۔

علمی قابلیت

حضرت ٹیپو سلطان بہت بڑے منشی تھے۔ طب، تجارت، معاملات اور مذہبی امور میں

بڑا کمال حاصل تھا۔

کرنل کرک پیاٹرک (جس کے ذمہ بعد زوال سلطنتِ خداداد سلطان کا کتب خانہ تھا) اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

"ٹیپو سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل ممیز تھی۔ اس قدر مختصر اور پُر معنی ہوتی تھی کہ ایک ایک لفظ سے کئی کئی معنی نکلتے تھے۔ آپ کی تحریر کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ ٹیپو سلطان کے قلم سے نکلی ہے۔ الفاظ میں تحکم پایا جاتا تھا۔"

آر۔ ہیچ کیمبل لکھتا ہے:

"ٹیپو سلطان نہایت آسانی سے نثر و نظم لکھتے تھے۔ اور آپ کے مضمون میں ایک شان پائی جاتی تھی۔

"کتاب "تحفۃ المجاہدین"، اور دوسری کتابیں جیسے "وقائع، منازل" "احکام نامہ" وغیرہ آپ کی خاص نگرانی میں لکھی گئی۔ ان کتابوں میں بہت سے مضامین اور اشعار خاص سلطان کی تصنیف ہیں۔

زہد و تقویٰ

ٹیپو سلطان ہر روز بلاناغہ بعد نماز صبح تلاوتِ قرآن مجید کرتے اور نماز کے اس قدر پابند تھے کہ مسجد اعلیٰ کی افتتاح کے موقعہ پر سوال اٹھا کہ سب سے پہلی نماز کون پڑھائے۔ اس موقع پر بڑے بڑے علماء اور مشائخ آئے ہوئے تھے۔ اور یہ طے پایا تھا کہ جو شخص صاحبِ ترتیب ہو وہی امامت کرے۔ مگر کوئی امامت کے لیے آگے نہ بڑھا تو سلطان یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے الحمدللہ میں صاحبِ ترتیب ہوں۔

چناں چہ پہلی نماز کی امامت خود سلطان نے کی۔

ایک دن عید کے بعد سلطان اپنی والدۂ ماجدہ کے محل سرا میں ادائے تہنیت کے لیے گئے۔ بعد تسلیم و نیاز کے وہیں ایک کمرے میں سو رہے۔ اس اثنا میں نواب حیدر علی بہادر کی دو منظورِ نظر کنیزیں سلطان کے پاس پہنچیں اور پیر دابنے لگیں۔ آنکھ کھلتے ہی آپ کو طیش آگیا اور کہنے لگے یہ تم نے کیا کیا تم میری مائیں ہو ـــــ

صاحبِ "نشانِ حیدری"، لکھتے ہیں حضرت ٹیپو سلطان کامل الحیا تھے اور یہ حیا آپ کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ دوسروں کو بھی اسی طرح حیادار دیکھنا پسند کرتے تھے۔

انگریز مورخین مشرقی بادشاہوں کو بدنام کر رکھے ہیں۔ کہ وہ حرم سرا میں صدہا عورتوں کو رکھ کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر ٹیپو سلطان کی ذات اس عیب سے بالکل

پاک تھی۔

ولکسن جیسا متعصب مورخ بھی اعتراف کرتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے محل میں کبھی تین سے زیادہ بیگمات ایک وقت میں نہیں رہیں۔ ان میں سے ایک کے انتقال کے بعد دوسری بیگم سے شادی ہوئی۔ سلطان کی شہادت کے وقت کوئی بیگم زندہ نہیں تھی۔

اطاعتِ والدین

حضرت ٹیپو سلطان نے کبھی اپنے والدین کے حکم سے سرتابی نہیں کی۔ بیسور گزیٹر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ 289 پر لکھتا ہے "آپ کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ اپنی والدہ کا حد درجہ احترام کرتے تھے ماں کی نصیحت سے کبھی آپ نے بے اعتنائی نہیں کی، گو بعض اوقات ماں کی باتیں آپ کی خواہشوں کے بالکل خلاف ہوتی تھیں۔

رحم دلی

ٹیپو سلطان کی رحم دلی کی ہزار ہا مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک مثال یہ ہے کہ جس وقت مرہٹوں سے جنگ چھڑی ہوئی تھی تو اس وقت خبر آئی کہ فوج کی زیادتی کی وجہ سے ایک گاؤں میں عورتیں دریا میں ڈوب کر مر گئیں۔ سلطان کو جب خبر پہنچی تو غصہ کی انتہا نہ رہی۔ اپنے سپاہیوں کو قابل عبرت سزائیں دیں تاکہ آئندہ ایسا نہ ہونے پائے۔ اسی جنگ میں مرہٹہ سرداروں کی عورتیں گرفتار ہو کر آئیں تو ٹیپو سلطان نے ان کو بہت عزت کے ساتھ ان عورتوں کو پالکی میں بٹھا کر تحائف گراں بہا کے ساتھ انھیں پونا روانہ کر دیا۔

وفات

ایسٹ انڈیا کمپنی جان چکی تھی کہ اگر سلطان کو اپنے ارادوں میں کامیابی کا موقع دے دیا جائے تو پھر ہندوستان پر ہرگز قبضہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے حیدر آباد اور مرہٹوں کو اپنا لے کر جو کچھ کیا اس کی خود تاریخ شاہد ہے۔ ٹیپو سلطان ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے استعمار فرنگ سے ہندوستان کو آزاد اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ با الفاظ دگر ہند کے سچے خیر خواہ اور محب تھے۔ اس لیے تاریخ میں ان کو ایک ایسا بلند مرتبہ حاصل ہے جو ہندوستان میں اب تک کسی حکمران کو نصیب نہیں ہوا۔ اگر زمانہ اس مرد مجاہد کے ارادوں کو پورا ہو نے دیتا تو آج تاریخ کچھ اور ہی ہوتی لیکن کچھ غدّاروں اور اقتدار کے لالچ والوں نے انگریزوں سے مل کر ٹیپو سلطان کو مٹانے کے لیے کچھ ناپاک منصوبے بنائے۔

چناں چہ ان سازشوں میں میر صادق، میر قمر الدین، میر معین الدین، میر قاسم علی اور پورنیا نے اندرونی طور پر انگریزوں سے ساز باز کر لیا اور ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔

4 رمئی 1799ء کی صبح مسلمان اور برہمن نجومیوں نے ٹیپو سلطان سے کہا کہ آج کا دن سلطان

کے لیے نا مبارک ہے۔ کچھ صدقہ دینا ضروری ہے۔
چنانچہ ٹیپو سلطان غسل کرکے دس بجے کے قریب ایک ہاتھی کالے مخمل کے جھول سے جس میں کئی سیر موتی اور جواہر ٹکے ہوئے تھے فقرا اور درویشوں میں تقسیم فرمایا۔ ایک بجے کے قریب اپنے وزرا اور امراء کے ساتھ تناول کے لیے بیٹھے۔ ایک لقمہ کھایا اس کے بعد دوسرا لقمہ اٹھاکر کھانا ہی چاہتے تھے کہ سید غفار و نادار کی شہادت کی خبر ملی۔ آپ نے لقمہ کو ویسے ہی چھوڑ دیا۔ دسترخوان سے اٹھے اور حاضر امراء و وزراء پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ "اُس غدّاری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہو گا جب تم اور تمہاری آیندہ نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہوکر ایک ایک دانہ کو ترسے گی"۔
یہ کہہ کر حضرت ٹیپو سلطان نے اپنی تلوار اور دونالی بندوق لیکر چھوٹے دروازے سے باہر نکلے۔ سپاہ برابر مستعدی سے اپنے اپنے کام پر لگے ہوئے تھے۔ مگر پورنیا اپنے منصوبے کے تحت تنخواہ دینے کے بہانے سپاہیوں کو مسجدِ اعلیٰ کے پاس آنے کا حکم دیا۔ سپاہی تنخواہ لینے چلے گئے ادھر انگریزی فوج کو سفید جھنڈا اڑا کر خبر دے دی گئی۔ وہ فصیل پر چڑھ کر قلعہ میں داخل ہو گئے جب ٹیپو فصیل کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ انگریزی فوج آچکی ہے۔ آپ اور آپ کے ساتھ جاں نثاروں نے انگریزی فوج کو بڑھنے سے روکنے لگے۔ یہاں نہ صرف نہ بندوقوں سے لڑائی ہو رہی تھی بلکہ تلواروں سے بھی جنگ ہو رہی تھی۔ ہر طرف سے انگریزی فوج نے آپ کو اور آپ کے جان نثاروں کو گھیر لیا اور گولیوں کی بارش برسانی شروع کر دی۔ آپ نے اور آپ کے جان نثاروں نے آخری سانس تک پامردی شجاعت اور نمک حلالی کا ثبوت دے رہے تھے یکے بعد دیگرے سب شہید ہونے لگے۔ ٹیپو سلطان قدم قدم پر مدافعت کرتے رہے۔ جب انگریز ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا تو آپ کے ایک افسر نے کہا حضرت خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیں شیر دل سلطان نے پلٹ کر غصہ سے جواب دیا۔
"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے"۔
پھر آپ لڑنے میں مصروف ہو گئے جنگ کے دوران دل کے قریب ایک گولی پیوست ہو گئی سلطان لڑکھڑا گئے۔ اس کے باوجود پوری ہمت باندھ کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ اتنے میں اور دو گولیاں سلطان کے جسم پر جڑ گئیں۔ آخر کار سلطان ۴ رمئی ۱۷۹۹ء بوقت سات بجے کے قریب جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔
صبح کے وقت جنرل ہارس کے حکم سے ٹیپو سلطان کا دیدار شہزادوں، ندیموں وغیرہ کو دکھا کر تجہیز و تکفین کا حکم دیا گیا۔ جنازہ نہایت

احترام واکرام کے ساتھ ۲۸ ذی قعدہ سنہ ۱۲۱۳ھ بوقت ظہر قلعہ سے روانہ ہوا۔ تمام شاہزادے سردار، اور عہدے دار شریک تھے۔ فوج کی چار کمپنیاں پیچھے ساتھ تھیں۔ راستہ میں جس گلی کوچہ سے حضرت ٹیپو سلطان کا جنازہ گزرتا تھا وہاں بلا تفریق مذہب وملت، مرد وزن کی صدائے نوحہ ماتم بلند ہوتی اور ایک قیامت برپا تھی۔ نواب حیدر علی خان کے مقبرہ پہ جس کو گنبد کہتے ہیں جنازہ ٹھہرایا۔ قاضئ شہر نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بارہ ہزار روپے فقراء میں تقسیم کئے گئے۔ اور اس پیکر جلال کو نواب حیدر علی کے پہلو میں سپرد خاک کردیا گیا

حضرت ٹیپو سلطان کی موت درحقیقت اسلامی جاہ وجلال کی موت تھی، اسلامی شان و شوکت کی موت تھی، ہندوستان کی آزادی کی موت تھی، ہندوستان کی غیرت وخودداری کی موت تھی۔

پروفیسر جائسر لکھتے ہیں:۔

ٹیپو سلطان کے حریف ہمیشہ آپ کو مٹانے پر آمادہ تھے۔ اور اندرون سلطنت اور آپ کے خاص افسر ہمیشہ آپ کے زوال کی سازشیں کرتے رہتے تھے مگر یہ مرد مجاہد سلطان ہی کا دل گردہ تھا کہ سترہ سال تک ان سب کا نہایت ہی ہوشمندی اور کامیابی سے ان کا مقابلہ کرتے رہے۔

ٹیپو سلطان کی بار بار یہ کوشش رہی کہ نظام الملک ان سے مل جائے مگر افسوس کہ اس نے اپنی سلامتی اس میں دیکھی کہ غیروں سے مل کر اس شیر کو مٹا دیا جائے۔

نمک حرام وزراء کی غداری اور دشمنوں کی سازش کی وجہ سے آخر سلطنت خداداد صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ سلطان شہید کی لاش پہ جنرل ہارس پہنچا اور فرط خوشی سے چیخ اٹھا کہ آج ہندوستان ہمارا ہے۔

ع
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

(ماخود و مستفاد از سلطنت خداداد)

فضیلتِ ذکرِ الٰہی

یل۔ رحمت اللہ پی ٹی یم : زمرۂ رابعہ۔ دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

آج مسلمان طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان سے رہائی کے مختلف تدبیریں ہورہی ہیں۔ لیکن حقیقی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اسلام کو مضبوطی سے تھام لیں اور اللہ کی یاد اور اس کے ذکر سے دلوں کو منوّر کرلیں تو ساری مشکلیں خود بخود ختم ہوجائیں گی۔ اور دلوں کو سکون اور اطمینان نصیب ہوگا۔ زندگی کا حقیقی سکون مادی اسباب میں نہیں بلکہ ذکر الٰہی میں پوشیدہ ہے۔ اسی لیے قرآن شریف نے ارشاد فرمایا: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب خبردار ہوجاؤ اللہ کا ذکر ہی سے پریشان دلوں کو سکون ملتا ہے۔ اور مضطرب دلوں کو راحت و اطمینان ملتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے: جب تجھ کو دنیاوی زندگی میں دکھ اور کوئی پریشانی ہو تو خدا کو یاد کرو اللہ تعالیٰ تیری ہر مصیبت و تکلیف کو دور فرمائے گا۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمان مصائب میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی ذکر و عبادات سے غافل ہے۔ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے جس کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: فرماتے ہیں کہ اللہ کے مقرب فرشتے گھومتے پھرتے ہیں اور جس جگہ اللہ کا ذکر کرنے والوں کو پاتے ہیں اپنے پیروں سے ان پہ سایہ فگن ہوتے ہیں۔ جب ذاکرین ذکر الٰہی سے فراغت پاتے ہیں تو فرشتے آسمان پہ چڑھ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ فرشتوں سے سوال کرتا ہے باوجود اُسے معلوم ہونے کے، تم کہاں سے آتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ ہم تیرے بندوں کے پاس سے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دوبارہ پوچھتا ہے: وہ کیا کر رہے ہیں؟ جواب ہوتا ہے بندے تجھے یاد کر رہے ہیں۔ پھر پوچھتا ہے، وہ کیا کہتے ہیں۔ جواب دیتے ہیں: تیری تسبیح و تہلیل اور تحمید و تقدیس بیان کر رہے ہیں۔ اس مکالمہ کو

کو شن کر اور احکم الحاکمین ارشاد فرماتا ہے کہ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انھیں بخش دیا۔
مذکورہ حدیث سے ذکرِ الٰہی کی بڑی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ذکرِ الٰہی سے دل روشن ہوتا ہے، روح میں تازگی آتی ہے جو لوگ ہمیشہ اس کی یاد میں لگے رہتے ہیں وہ ہر رنج و غم سے مامون و مطمئن ہوتے ہیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو آنکھوں کے لیے ٹھنڈک اور قلب و روح اور ذہن کے لیے راحت قرار دیا ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے:
فاذکرونی اذکرکم ذاکروا اللّٰہ ذکراً کثیراً لعلکم تفلحون:
تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تمہیں فلاح اور کامرانی نصیب ہو۔
ان آیتوں سے یہ بات بخوبی واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ اللہ کو یاد کرنے میں ہماری بھلائی ہے اور وہ بھی ہمیں یاد رکھتا ہے اور جب ہم اسے یاد نہ کریں گے تو وہ بھی ہمیں یاد نہیں کرے گا۔ غرض ہر مسلمان کو رات اور دن ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ اس کی ہر ایک سانس اور اس کی ہر ایک نقل و حرکت کو دیکھتا ہے اور سنتا ہے اگر انسان زندگی بھر اس کی عبادت کرتا رہے تب بھی وہ اس

کی نعمتوں کا شکر یہ ادا نہیں کر سکتا اور جب تک کہ اس کے اندر عجز و انکساری، خوف و تقویٰ موجود نہ ہو تو وہ حقیقی معنوں میں ذاکر اور شاکر نہیں بن سکتا۔
قدیم زمانے کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ عمر فرمائی تھی، کسی کو چار سو سال اور کسی کو پانچ سو سال، کسی کو ہزار سال اور وہ اپنی تمام زندگی کو خدا کی یاد میں گزارتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک بزرگ کا واقعہ ہے۔
ایک بزرگ نے اپنی چار سو سالہ زندگی صرف عبادت و ریاضت میں گزاری۔ جب موت آگئی تو منکر نکیر کے سوال و جواب کے بعد حکم ہوتا ہے کہ اس عابد کو دوزخ میں ڈال دو۔ عابد یہ سن کر حیران پریشان ہوئے اور التجا کرتے ہیں کہ یا الٰہی میں نے تو اپنی ساری زندگی تیری عبادت میں گزاری پھر ہمارا میرا یہ مقام۔ احکم الحاکمین ارشاد فرماتے ہیں:
بے شک تو نے اپنی ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزاری لیکن تو نے اپنے آپ کو جنت اور دیگر انعام و اکرام کا مستحق اور حقدار سمجھ بیٹھا اور ہماری ایک نعمت کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا۔
اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر و عبادت کے ساتھ شکرِ خداوندی بھی بہر حال ضروری ہے اور عبادت کی وجہ سے اپنے تقدیس و پارسائی کا گھمنڈ بہت خطرناک اور مہلک ہے۔ اور جب اس بزرگ کو تنبیہ ہوئی تو عاجزی و انکساری کے ساتھ اللہ

تعالیٰ کے فضل و رحمت کے طلب گار ہوئے اس وقت دریائے رحمت کو جوش آیا اور اس بزرگ کی مغفرت ہو گئی۔

سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ؎

طالب بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بدرگاہِ خدا آور دہ !

اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اپنی خطا و تقصیر کی معذرت کرتا رہے اور اپنے اندر کبھی تکبّر و گھمنڈ کو جگہ نہ دے اسی میں فلاح و بہبودی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کوئی شخص اللہ رب العزّت سے ملنا چاہتا ہے تو کیا کرے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اہل اللہ کی خدمت کرے۔ پھر پوچھا گیا اللہ تعالیٰ کے بھی اہل ہیں؟ فرمایا کہ ہاں: وہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: قرآن مجید پڑھنے والے اور اس کی تعظیم کرنے والے۔ جس نے اس کی تعظیم کی اللہ تعالیٰ ان کا اکرام کرے گا۔

حقیقت میں اہل اللہ کی ظاہری حالت میں کوئی شان دبدبہ نظر نہیں آتا لیکن باطنی طور پر ان کا دل ایسا روشن ہوتا ہے کہ دوسروں کے دل کی حالت قلبِ روشن سے ان پر منکشف ہو جاتا ہے۔ اور وہ تمام احوال و واقعات آیندہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔

علامہ اقبال رحمؒ نے سچ کہا ہے: ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہے تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

حاصل کلام!

ذکرِ الٰہی مسلمان کے قلب و روح کی غذا ہے۔ اس کے بغیر اس کو زندگی میں حقیقی سکون نہیں ملتا۔ اور ذکر چند الفاظ اور کلمات کے پڑھنے اور ورد کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و خوشنودی اور آخرت کے واسطے جو بھی نیک اعمال کئے جائیں وہ سب ذکرِ الٰہی میں شامل ہے۔ ⁂

بقیہ فضیلت حج بیت اللہ

بادشاہ نے کہا: میرے پاس تو دنیا کا ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ معاملہ کیسے ہو؟

درویش نے کہا: اے بادشاہ آپ کے لیے بہت آسان ہے۔ جس کسی مظلوم کی آپ نے دادرسی کی ہے اس گھڑی اور ساعت کے عدل کا ثواب مجھے دے دو۔ میں تمہیں ساٹھ حج کا ثواب بخش دوں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مظلوم کی حمایت اور ٹوٹے دل کی امداد حج کے ثواب سے کم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے بدست دعا گو ہوں کہ ہر صاحب استطاعت کو حج کرنے کی توفیق دے۔

وما علینا الا البلاغ ۔ ⁂

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی اور بے تکلفی

حافظ امجد پاشا لطیفی۔ ویلور

اللہ تعالیٰ جب سے اس دنیا کے اندر بنی آدم کو پیدا فرمایا تو اس میں بادشاہ بھی پیدا ہوئے، امیر بھی پیدا ہوئے غریب و فقیر بھی پیدا ہوئے۔ ہر طبقہ کے انسانوں کو دنیا میں وجود میں لایا۔ اب بھی لا رہا ہے۔ اور آیندہ بھی لائے گی۔ اس دنیا میں، سلیمان ذوالقرنین جیسے بادشاہ، نمرود و بخت نصر جیسے شاہ یہ چار بادشاہ ایسے ہیں جنھوں نے ساری دنیا میں حکومت کی۔ عثمان غنیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسے دولت مند قارون و شدّاد جیسے مال دار، حضرت بلالؓ جیسے حبشی اور حضرت ابوہریرہؓ جیسے مفلس یہاں تک کہ تاج دارِ مدینہ احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے دُرِّ یتیم بھی پیدا ہوئے۔

غرض کہ اس عالم میں بادشاہ بھی، امیر بھی، غریب بھی، فقیر بھی، مفلس بھی سب پیدا ہوئے اور اپنی اپنی زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔

تمام انسانوں میں جہاں تک غریب و مفلس کا سوال ہے بے چاروں کے پاس دولت ہی کہاں کہ دنیا کے اندر عیش و عشرت و آرام کی زندگی گزاریں۔

رہی بات ان احباب کی جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت عطا کی اور دولت کے ساتھ بادشاہت بھی عطا کیا، ماشاء اللہ ان حضرات میں سے دنیا کے اندر اکثر و بیشتر تو ایسے ہی گزرے کہ انہوں نے عیش و عشرت کے کسی بھی پہلو میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑا۔ مکان کے اعتبار سے، کھانے پینے کے اعتبار سے، لباس کے اعتبار سے، شادی بیاہ کے اعتبار سے، مکان بنا تو اعلیٰ سے اعلیٰ بے نظیر و بے مثل، کھانے کا وقت آیا تو بہترین مرغن غذائیں، لباس کا نمبر آیا تو عمدہ سے عمدہ شاہانہ ریشمی لباس، شادی کا موقعہ آیا تو بہترین حسینہ جو اپنے حسن و جمال سے یکتا ہو۔ سواری کا نمبر آیا تو بہترین خوب صورت اور تیز رفتار سواری حاصل۔ یہ کہ جہاں ضرورت کا موقعہ آیا تو اپنی ضرورت کو پورا کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ چناں چہ اس عالم میں جو بادشاہ گزرے ہیں ان کا ذرا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ کیسے ٹھاٹھ کی زندگی گزاری تھی۔

فرعون نے اپنے محل کو ایسا بنایا کہ دریائے نیل اس کے اطراف و اکناف بہہ رہا تھا۔ شدّاد نے تو دنیا کے اندر اپنے مکان کو جنّت سے موازنہ کر کے بنایا کہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں نے دنیا ہی کے اندر جنت بنادی یہ اپنا مکان ایسا بناتے تھے کہ وہ پورے طور پر محفوظ اور ایک ایسا مضبوط قلعہ کہ ہر کس و ناکس کو اندر جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ جب تفریح کرنا ہوتا تو پہلے ہزاروں گھوڑے سوار کا لشکر آگے اور پیچھے درمیان میں شہنشاہِ وقت پوری آن بان کے ساتھ اور اپنے آپ کو ایسا آراستہ و پیراستہ کر دیا کہ ہزاروں کا مجموعہ کیوں نہ ہو پتہ چل جاتا تاج و لباس کا بادشاہ فلاں ہے۔

لیکن دنیا کے سلطانِ عرب محمد عربی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ذات کو آج تک نہ پیش کر سکی۔ اور نہ پیش کر سکے گی۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپؐ کی ساری زندگی ولادت کے وقت سے لے کر دنیا سے رخصت فرمانے تک سیدھی سادی تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہو گا کہ نبی کریمؐ کی سیرت کا ہر پہلو سادگی سے بھرپور تھا۔ کوئی بھی سادگی سے خالی نہیں۔

آپ کا لڑکپن ہو یا جوانی معلم قدس بننے سے پہلے یا بننے کے بعد، واعظ یا ناصح بننے سے پہلے یا بننے کے بعد، بدر و حنین کے سپہ سالار ہونے سے پہلے یا ہونے کے بعد، فاتح اعظم بننے سے پہلے یا بننے کے بعد، رسالت سے قبل ہو یا رسالت کے بعد سادگی اور بے تکلفی آپؐ کا شعار تھا۔ آپؐ تو اخلاق و کردار کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ جس کی قرآن نے گواہی دی: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

آپؐ کا مکان

کوئی مضبوط قلعہ اور محل نہیں تھا بلکہ آپؐ کا دولت کدہ معمولی سا ایک جھونپڑا تھا۔ اور وہ بھی اتنا پست کہ اگر آدمی کھڑا ہو جائے تو سر چھت کو اور اتنا تنگ کہ اگر کوئی لیٹ جائے تو پھر سجدہ کرنے کی جگہ نہ رہے۔ امہات المومنین حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آپؐ اپنی رات کو نوافل کے پڑھنے میں گزارتے اور میں لیٹی رہتی۔ ہمارا مکان اتنا تنگ تھا کہ آپؐ کو سجدہ کرنا ہوتا تو میں پیر موڑ لیتی۔ پھر آپؐ سجدہ کرتے۔ یہ تھی آپؐ کے مکان کی لمبائی اور چوڑائی اور ایسا بوسیدہ کہ اگر بارش پڑ جائے تو پانی ٹپکے اور سورج نکلے تو تیز شعائیں گھر میں پھیلیں

آپؐ کی غذا

اللہ اکبر اس پہ کیا قلم اٹھایا جائے۔ اکثر و بیشتر فاقہ ہی فاقہ گزرتا تھا۔ گاہے ماہے تناول کرنے کا موقعہ ہوتا تھا۔ اور وہ بھی مرغن غذائیں نہیں۔ کچھ تو کچے پکے کھجور اور کبھی سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے یہ تھی آپؐ کی شاہی غذا

آپؐ کا لباس

ساری زندگی میں صرف ایک مرتبہ کے علاوہ کوئی قیمتی

چادر جسم کی زینت نہیں بنی وہ بھی چند ساعت کے لیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پیوند دار چادر آپؐ کے جسم کی زینت تھی۔

آپؐ کا نکاح

آپؐ نے نکاح کیا تو عام مسلمانوں کی طرح خوبصورت مہ جبین حسینہ اور کم عمر والی کنواریاں نہیں تھیں۔ بلکہ آپؐ کے ازواج مطہرات میں سے سوائے عائشہؓ کے تمام کی تمام شادی شدہ ہی تھیں، کوئی بیوہ، کوئی مطلقہ کوئی عمر رسیدہ خاتون۔

آپؐ کی سواری

کوئی برق رفتار گھوڑا نہیں، بلکہ ایک دبلی پتلی فاقہ زدہ اونٹنی پر۔ تیل ملتے اور اس کی نگرانی کرتے۔ یہ تھی بدر وحنین کے سپہ سالار کی سواری۔

بے شک آپؐ سلطان عرب تھے فاتح اعظم بھی تھے، بدر وحنین کے سپہ سالار بھی تھے استاذ و معلم بھی تھے، واعظ و ناصح بھی تھے، رسولِ برحق بھی تھے۔

لیکن خدا گواہ ہے، زمانہ گواہ ہے آپؐ کی سیرت گواہ ہے، تاریخ گواہ ہے کہ آپؐ نے آپ کے بادشاہ ہونے کو اپنے رسولِ برحق ہونے کو آپ کے معلم ہونے کو آپؐ کے ناصح و واعظ ہونے کو کسی خاص امتیازی شان و شوکت سے ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس سادگی اور بے تکلفی سے آپؐ مجلس میں تشریف فرماتے کہ کوئی اجنبی آجاتا تو معلوم نہ کر پاتا کہ ان میں سے محمدؐ عربی کون ہیں؟ ظاہر بات ہے کیوں کہ آپؐ کے لیے شاہی تاج، شاہی تخت نہیں تھا شاہی آداب وسلام نہیں تھے بلکہ سادگی ہی سادگی رہتی تھی کہ پتہ بھی نہ چلتا کہ کون اللہ کے رسولؐ کون سلطان عرب ہیں کون بندہ نواز ہیں جب بتلایا جاتا کہ محمد آپؐ ہیں تو پھر پتہ چلتا کہ محمدؐ آپ ہی ہیں۔

بخاری شریف کی ایک روایت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بینما نحن جلوس مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم اس اثنا میں کہ ہم حضور کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے دخل رجل علی جمل کہ ایک آدمی (بدوی) اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور اپنے اونٹ سے اتر کر اونٹ کو بٹھا دیا اس کو باندھ کر پھر داخل ہو کر کہنے لگا: ایکم محمد ایکم محمد تم میں سے محمد کون ہیں؟ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپؐ کس سادگی کے ساتھ جلوہ گر تھے وہ پوچھتا ہے ایکم محمد ایکم محمد جب بتلا دیا گیا کہ آپؐ محمدؐ ہیں تو اس آدمی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ابن عبد المطلب اے عبد المطلب کے بیٹے تو آپؐ نے فرمایا قد اجبت میں تمہیں جواب دینے کے لیے بیٹھا ہوں: فقال الرجل للنبیؐ پس اس انسان نے کہا: انی سائلک میں آپ سے کچھ سوالات کرنے والا ہوں فمشدد علیک المسئلۃ اور سوالات میں کچھ تشدد بھی کروں گا کچھ سختی برتوں گا: فلا تجد علی فی نفسک مگر آپؐ مجھ پر اپنے جی میں غصہ نہ ہوں۔ فقال سل عما بدالک آپؐ نے فرمایا جو چاہو پوچھو یہ واقعہ آپؐ کی سادگی کی انتہا کو بتلاتا ہے کہ کیسے آپؐ

بے تکلّف تھے۔ مسائل کا سوال اور آپؐ کا جواب قابلِ غور محل ہے۔ سائل پوچھ رہا ہے: یا ابن عبد المطلب: اے عبدالمطلب کے بیٹے۔ اس کے اندر نہ کوئی تعظیم کی بو آتی ہے اور نہ بادشاہ کے القاب نظر آتے ہیں۔ آپؐ کی سادگی کس درجہ آفاق کو پہنچی ہوگی۔ بلا کسی القاب کے سلطانِ عربؐ سے کہتا ہے یا ابن عبد المطلب۔ آپؐ کا بے تکلفانہ جواب کہ بھائی ہیں تو آپ کے جواب دینے کے لیے ہی بیٹھا ہوں پھر سائل کہہ رہا ہے میں اپنے سوالات میں سختی بھی کروں گا، تشدّد بھی برتوں گا۔ لیکن آپ بے تکلفی سے بھرا جواب دیتے ہیں سل عمابدالک بلا کسی جھجھک کے اور ملال کے بے تکلف ہو کر جو چاہو، جیسے چاہو پوچھو۔

ایک موقعہ پر آپؐ بیٹھے رہتے ہیں اور ساتھ میں صدیق اکبرؓ بھی تھے۔ ایک آدمی آیا، آپؐ سے ملاقات کیا، دوسرا آیا وہ بھی ملاقات کیا۔ تیسرا آیا وہ بھی ملاقات کیا۔ اب لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہی محمدؐ ہوں گے۔ مسلسل لوگوں نے ملاقات کرنا شروع کر دیا۔ آپ سے ملے اور ملنے کے بعد آپؐ کو جگایا اور جگانے کے بعد پتہ چلا کہ جس کو محمدؐ سمجھ کر ملاقات کئے وہ دراصل محمدؐ نہیں تھے بلکہ محمدؐ تو وہی ہیں جو فقیرانہ و عارفانہ طرز پہ بغیر کسی نرم و گرم بستر کے آرام کر رہے تھے۔ غرض کہ ویسے تو آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو سادگی و بے تکلفی سے بھرپور رہا۔ کوئی بھی پہلو اس سے خالی نہ تھا۔ اور خصوصی طور پہ یہ دونوں واقعات کہ ان سے آپؐ کی سادگی و بے تکلفی ٹپکتی ہے دنیا نے آپؐ جیسے بے تکلّف بادشاہ نہ پیش کیا ہے نہ پیش کرے گا۔ آپؐ حقیقت میں دُرِّ یتیم ہیں اور سادگی و بے تکلفی کے اعتبار سے بھی آپؐ دُرِّ یتیم بے نظیر و بے مثل ذات ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

محمد صابر حسین بلگام : زمرۂ ثانیہ۔ دارالعلوم لطیفیہ بمکان حضرت قطب ویلور

حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رُکن ہے۔ جو ہر صاحبِ استطاعت پر فرض ہے اور یہ عالم گیر عبادت ہے جس سے مسلمانانِ عالم کی اجتماعیت، اتحاد اور یگانگت کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے بیت اللہ شریف کی فضیلت اور بزرگی اس سے بڑھ اور کیا ہو سکتی ہے۔ خود باری تعالیٰ محض اسے انسانوں کے خاطر اپنی عبادت کے لیے پہلے پہل بنایا نیز اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی کھلی نشانیاں رکھی ہیں تاکہ ہر دیکھنے والے کو خدا کی قدرت کے مناظر نظر آئیں۔ اور بیت اللہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا دینی و روحانی مرکز اور عبادت کا قبلہ ہے۔ پروردگار عالم ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِينَ فِيهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔

بے شک پہلے پہل جو عبادت گاہ لوگوں کے لیے تعمیر کی گئی وہ مکہ مکرمہ میں ہے جو دونوں جہاں کے لیے باعثِ ہدایت ہے: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: اے نبیؐ! آپ اپنا چہرہ قبلہ کی جانب کیجیے۔ بیت اللہ شریف کے متعلق علامہ اقبالؒ کیا ہی خوب فرماتے ہیں: ؎

دنیا کے بتکدوں میں پہلا گھر وہ خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

ساری کائنات کے مسلمان کششِ ایمانی سے اس مقام پر یوں کھنچے چلے آتے ہیں جس طرح پروانے شمع کے گرد جمع ہوتے ہیں اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس صدا کا نتیجہ ہے جو آپؑ نے اپنے ربّ کے حکم کے مطابق لگائی تھی۔ آپؑ کی اس آواز پر جن ارواح نے لبیک کہا ان کو اللہ تعالیٰ اپنے دربار میں لیتا ہے اور وہ یہاں پہنچ کر روزِ اول

کئے ہوئے عہد و پیمان کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بے ساختہ اقرار یوں کرتے ہیں۔

لبیك اللّٰھم لبیك لاشریك لك لبیك ان الحمد والنعمۃ لك والملك لاشریك لك : میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں اور ملک تیرے لیے ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں۔

میدانِ عرفات میں جو اتحاد اور یگانگت اور مسلمانانِ عالم کے عظیم الشان اجتماع سے ظاہر ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حجاج کرام اپنے اپنے گھروں سے مختلف رنگوں اور انواع واقسام کے لباس زیبِ تن کر کے آتے ہیں لیکن حدودِ حرم میں آنے کے بعد سب کو ایک ہی لباس پہننا پڑتا ہے جس طرح حج کا ظاہری لباس مختلف تہذیب و تمدن، رنگ و نسل اور ذات پات کو مٹا کر تمام مسلمانانِ عالم میں یکسانیت پیدا کرتا ہے اسی طرح باطنی طور پر مسلمانوں میں اتحاد و یکسانیت کے لازوال اثرات پیدا کرتا ہے۔ مسلمانانِ عالم کل مومن اخوۃ کے مصداق مظہر بن جاتے ہیں۔ اور مختلف زبانوں کے لوگ یک زبان ہو کر لبیك اللّٰھم لبیك کی صدائیں بلند کرتے ہیں۔ اللہ کے حضور اپنی حاضری کی اظہار کرتے ہیں۔ اور اقرار کرتے ہیں۔ سوا اس کے کوئی شریک نہیں ایک ہی لباس ملبوس انسانوں سے بھرا ہوا یہ میدان عرفات ایک ایسا ماحول اور نقشہ پیش کرتا ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی ذات وصفات اور تجلّیاتِ الٰہیہ کے تمام پہلو نمایاں اور عیاں طور پر نظر آتے ہیں۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا : مَنْ حَجَّ الْبَیْتَ وَلَمْ یَزُرْنِی فَقَدْ جَفَانِی : جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی تو اس نے مجھ پر ظلم کیا۔

اس حدیث شریف سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جس نے حج کیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی تو وہ حاجی نہیں بلکہ ظالم بن کر لوٹے گا۔

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ اس وقت آپؐ کے پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا اور عرض کیا : یا رسولؐ اللہ آپؐ کے رونے کا سبب کیا ہے ؟ فرمایا : میں امّت کے لیے روتا ہوں۔ کہ ان کو چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ میرے سامنے وہ گناہ کرتے تھے اور اُن کی شفاعت کرتا تھا۔ ابھی آپؐ نے یہ بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ خوش خوش

نظر آنے لگے ہیں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ کے خوش ہونے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا جبرئیلؑ میرے پاس تشریف لائے اور کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آپؐ کے انتقال کے بعد جو بھی آپؐ کی قبر کی زیارت کرے گا میں اس کو بخش دوں گا۔ اگرچہ کہ وہ خود آمرزش نہ چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہے۔

مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ وَفَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ: جس نے میری حیات کے بعد میری زیارت کی تو وہ ایسا ہے کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارکہ میں زندہ اور سالم ہیں۔ جیسا کہ مشکوٰۃ شریف کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون: اللہ کے نبی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے صرف اللہ تعالیٰ کے لیے حج کیا اس میں خواہشاتِ نفسانی اور گناہوں سے بچا تو وہ گویا ایسا ہو کر لوٹتا ہے، جیسا کہ اس دن تھا جس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

مَنْ حج فلم یرفث ولم یفسق کیوم ولدتہ امہ: گویا دوسرے الفاظ میں حاجی ایک نئی زندگی، ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں شامل ہوتی ہیں۔

حج اسلام کا رکن ہی نہیں بلکہ وہ وہ دنیا میں اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر پہلو پر حاوی ہے اور مسلمانوں کی عالمگیر اور بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بڑا اور بلند مینار بھی ہے اور حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر اُتارنے تک ہر حاجی نیکی اور پاک بازی نیز امن وامان اور سلامتی کی مکمل تصویر بنا رہے اور وہ لڑائی جھگڑا، جنگ وجدال، قتل وخوں ریزی دنگا فساد اور کسی کو کوئی تکلیف نہ دے۔ یہاں تک کہ بدن اور کپڑوں کی چیونٹی بلکہ جوں تک کو نہ مارے اور نہ کسی کا شکار کرے اس لیے کہ وہ اس وقت صلح اور آشتی کا پیکر اور امن و امان کا مجسمہ ہوتا ہے۔

حج میں ایک عمل قربانی بھی ہے۔ جس کا اس عبادت سے خاص مناسبت ومطابقت ہے۔ قربانی یکساں طور پر تین ایام میں رکھی گئی اور اس عظیم عمل کے صلہ میں اللہ تعالیٰ اتنی کثیر تعداد

تعداد میں نیکیاں عطا فرماتا ہے جتنے کہ اس جانور کے جسم پر بال ہوتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خانہ کعبہ کو فرشتے عروس کی طرح آراستہ کریں گے اور میدانِ حشر میں لے چلیں گے۔ اثنائے راہ میں میری قبر کی طرف سے ہو کر گزرے گا اور بزبانِ فصیح مجھ سے کہے گا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور میں اس کے جواب میں کہوں گا وَعَلَیْکَ السَّلَامُ یَا بَیْتَ اللّٰہِ تو میری امت کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری امت سے جو بھی شخص میری زیارت کیا ہے تم اس کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ باقی سفارش آپ کیجیے گا

آپؐ نے فرمایا: حجِ مقبول کی نشانی یہ ہے کہ حاجی کا حال اس کا حال سے بہتر ہو جائے جو حج کرنے سے پیشتر تھا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ نے عرفہ کی شب دو فرشتوں کو خواب میں دیکھا ایک فرشتے نے دوسرے فرشتے سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ امسال کتنے حاجی تھے؟ کہا: نہیں! چھ لاکھ تھے۔ پھر پوچھا: کتنوں کا حج مقبول ہوا؟ فرمایا: چھ آدمیوں کا حج قبول ہوا۔

وہ بزرگ کہتے ہیں کہ میں ہیبت کے مارے نیند سے اٹھا اور نہایت غم گین ہوا اور کہا: ہرگز میں اُن چھ میں سے نہ ہوں گا۔ اس اندیشہ اور غم سے بیت الحرم میں پہنچا اور سو گیا پھر وہی دونوں فرشتے میرے خواب میں آئے اس میں سے ایک نے کہا: تو جانتا ہے کہ حق تعالیٰ نے خلائق میں کیا حکم کیا ہے؟ کہا: نہیں پھر فرمایا: ایک حاجی کی خاطر ایک لاکھ حاجی کو بخش دیا۔ پھر میں شاد ہو کر خواب سے بیدار ہوا اور شکرِ حق ادا کیا۔

ایک بادشاہ حج کو جانے کے ارادے کا اظہار کیا۔ لیکن ارکانِ سلطنت سے مشورہ دیا کہ بادشاہ ملک سے باہر جائے گا تو امورِ سلطنت میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ بادشاہ نے پوچھا پھر یہ ثوابِ حج کس طرح حاصل کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ اس ملک میں ایک درویش ہے جو ساٹھ حج ادا کر چکا ہے ممکن ہے وہ ایک حج کا ثواب آپ کے ہاتھ کر دے۔

بادشاہ درویش کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے پوچھا: کیا آپ ایک حج کا ثواب میرے ہاتھ فروخت کر سکتے ہو؟

درویش نے کہا: ہاں

بادشاہ نے پوچھا: ایک حج کے ثواب کا کیا معاوضہ لوگے؟

درویش نے کہا: ہر حج کے لیے جو قدم میں نے اٹھایا وہ تمام برابر ہے۔

(بقیہ صفحہ 178 پر ملاحظہ ہو)

عدل ایک ایسا جوہر ہے جس سے ملک اور قوم کی زینت قائم ہے۔ عدل کی تعریف علماء نے یہ کی ہے:

وضع الشئی فی محلہ: کسی چیز کو اس کے صحیح مقام و محل میں رکھنا۔

قرآنِ کریم میں اکثر جگہوں پر اس کی تاکید آئی ہوی ہے۔

ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان

بے شک اللہ حکم فرماتا ہے کہ لوگ عدل و احسان کو تھامے رہیں۔

حدیثِ شریف میں آیا ہے کہ بادشاہوں کا ایک گھنٹہ عدل کرنا ان کی ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

عدل کرنے والے قیامت میں نور کے ممبروں پر ہوں گے اور عادل بادشاہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے سایہ میں کے نیچے ہوں گے۔ وہ جہاں بھی ہوتا ہے وہاں ہمیشہ نعمت برستی ہے اور فرشتے اس کے نگہبان ہوا کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی کو حاکم بناتے تو فرماتے کہ لوگوں کی حاجت روائی کے وقت پر دروازہ بند نہ رکھو تاکہ مظلوم اپنا حق حاصل کرے۔ اگر بادشاہ عادل ہے تو وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور اگر ظالم ہے تو وہ شیطان کا خلیفہ ہے۔

عدل سے متعلق نوشیرواں کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ وہ شکار کے لیے نکلا اتفاق سے شکارگاہ میں نمک نہیں تھا۔ نمک لانے کے لیے ایک شخص کو گاؤں بھیجا اور کہا کہ نمک قیمت دے کر لانا، تاکہ بدامنی اور بے انصافی نہ پھیل جائے۔

لوگوں نے تعجب سے پوچھا: اتنی سی بات میں کیا بدامنی ہوگی؟

نوشیرواں نے کہا کہ دنیا میں پہلے ہی
تھوڑا ظلم ہوا ہے بعد میں جو کوئی بھی آیا اس
نے اس پر زیادتی کی۔

نوشیرواں کے عادل ہونے ہی کی وجہ سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخریہ فرماتے تھے کہ
میں عادل بادشاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا۔

حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نوشیرواں
کے عدل سے متعلق فرماتے ہیں:

چوں نوشیرواں عدل کرد اختیار
کنون نام نیک ست ازو یادگار

نوشیرواں اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اس
کا نیک نام آج بھی مخلوقِ خدا کی زبان پر جاری
وساری ہے۔ کیوں وہ اپنے اندر عدل کا جوہر رکھتا
تھا۔

دنیا کا قیام چار چیزوں پر ہوتا ہے۔ اوّل
علماء، دوم: امراء، سوم: فقیروں کی دعا لینا
چہارم: بادشاہ کا عادل ہونا۔

قیامت میں بادشاہوں سے پہلے عدل
ہی کے متعلق سوال کیا جائے گا اور عدل کے متعلق
حساب کتاب لیا جائے گا:

اول ما یحاسب بہ الامراء العدل

سلطان ملک سے متعلق عدل کے بارے
میں ایک واقعہ ہے:

کہ وہ شکار کے لیے تشریف لے گئے۔ شام
کے وقت اصفہان کے کسی قریہ میں قیام کیا۔ شاہی
غلاموں نے جنگل میں ایک گائے پائی اور اس کو ذبح
کرکے کباب بنا کر کھا گئے۔ وہ ایک بوڑھی عورت
کی گائے تھی۔ جس کے دودھ سے وہ تین یتیم
بچوں کی پرورش کرتی تھی۔ بوڑھیا کو اس کی خبر
ہوئی تو اس کے ہوش جاتے رہے۔

دوسرے روز بوڑھیا سرِ راہ کھڑے
سلطان کا انتظار کرتی کھڑی تھی۔ جب بادشاہ
کی سواری گزری تو بوڑھیا نے فریاد بلند کی کہ اے
بادشاہ میری فریاد سنیئے۔ اور کہا اگر تم نے میرا
انصاف نہ کیا تو پل صراط میں تیرا دامن نہیں چھوڑوں
گی۔ تجھ کو اختیار ہے کہ چاہے تو اس دنیا کے پل
اختیار کر یا آخرت میں پل صراط۔

بادشاہ نے کہا: مجھے آخرت کا پل صراط
اختیار کرنے کی طاقت نہیں۔ اسی پل پر اختیار ہے
بتا تو کیا کہنا چاہتی ہے؟

بوڑھیا نے کہا: میرے معاش کی کل
کائنات ایک گائے تھی۔ جس سے تین یتیم بچے
پرورش پا رہے تھے۔ تیرے غلاموں نے اس
کو کباب بنا کر کھا گئے۔ میرا دل رنج وغم سے
کباب ہو گیا۔

بادشاہ نے جب یہ ظلم وستم سنا تو اسی
وقت تحقیق کی اور ان غلاموں کو سخت سزا دی
اور بوڑھیا کو دودھ دینے والی ستر گائیں

عطا کیں ۔ بوڑھیا بادشاہ کو دعائیں دیتی ہوئی لوٹ گئی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کے انتقال کے بعد ایک عارف باللہ نے اس بادشاہ کو خواب میں دیکھا اور اس کا حال دریافت کیا، سلطان نے جواب دیا کہ اگر بوڑھیا کی شفارش نہ ہوتی تو میرا ٹھکانا اور حال بُرا ہوتا ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو حاکم ہے وہ لوگوں پر نگہبان ہے ۔ رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔[1] لہٰذا ہر بادشاہ کو لازم ہے کہ ہر حال میں عدل کا دامن نہ چھوڑے

عدل کے ارکان یہ ہیں کہ بادشاہ نہایت اطمینان سے مظلوم کی فریاد سُنے اور انصاف کرے ان کے ساتھ مہربانی کرتے ہوئے اس کی ضروریات کو پوری کرے اور اس کی بسیار گوئی ملول خاطر نہ ہو اس لیے کہ وہ طبیب کے مانند ہے اور مظلوم بیمار کی طرح ہے ۔ جب تک حکیم مریض کی پوری بات نہ سُنے اور اس کی تمام باتوں پر غور نہ کرے تو وہ کما حقہٗ مریض کے مرض کی پوری کیفیت سے مطلع نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر پوری اور صحیح تشخیص ممکن نہیں ۔

حاصل کلام!

عدل وانصاف ایک ایسی شئے ہے جس کے بغیر ملک میں، قوم میں امن کا قیام ممکن نہیں ۔ اس لیے اسلام نے اپنے متبعین کو عدل وانصاف کے اختیار کرنے کی سخت تاکید کرتا ہے ۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے : اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل : جب لوگوں کے درمیان معاملات کا فیصلہ کرنے لگو تو ہر حال میں انصاف پر فیصلہ کرو ۔

اس طرح اسلام نے حق وانصاف اور عدل کے معاملہ میں اپنوں اور غیروں کی تمیز ختم کر دی ہے اور ہدایت دی کہ اگر ظالم وجابر تمہارے خونی رشتہ دار اور بھائی ہوں تو بھی ان کا ساتھ نہ دو ۔ اور اگر تمہارے دشمن حق وانصاف اور عدل پر قائم ہوں تو اُن کا ساتھ دو ۔ قرآنِ کریم کی اس ایک چھوٹی سی نصیحت میں قومِ مسلم کی ترقی کا راز اور زوال کا سبب پوشیدہ ہے ۔

وما علینا الا البلاغ ۔

[1] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

ادارہ

حضرت شاہ حیدر ولی اللہ قادری علیہ الرحمہ کے فرزند ارجمند حضرت شاہ کریم اللہ قادری علیہ الرحمہ کے خوارق سے ایک خارق کا مفہوم خیز ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے، جس میں آپ کے ایک مرید کی دیوانگی و خبطیت اور اس کا حضرت پر وار کرنے اور حضرت کا اس کے ساتھ شفقت و مرحمت سے پیش آنے کا تذکرہ ہے۔

خارقہ بستم

چنیں گویند کہ روزے آں حضرت بر عادت معہودہ جشنے مکیفانہ از انواع کیفیت ترتیب دادہ و ہم جلیسان و خادمان خود در خانقاہ عالی نشستہ بود پیالہا ے کوکنار و قیلو نہاے تنبا کو زیر حکم دود در مجلس میگردانید و ہمہ اہل مجلس از انواع کیفیات شادان و سرخوش گشتہ با ہر یکے از ہر درے در سخنان مشغول بودند و آں حضرت در آں وقت جامہ و سوزن در دست گرفتہ و ریختہ زدن کلاہ سر مبارک خود چناں مشغول گشتہ کہ غیر از جامہ و سوزن نظرش بچپ و راست نمی دوید۔ قضارا از زمرۂ خادمان آنسرور یکے

بیسواں خارقہ

منقول ہے کہ ایک روز آں حضرت اپنی عادت کے مطابق ایک پر کیف جشن ترتیب دیا اور اپنے ساتھیوں اور خادموں کے ساتھ خانقاہ عالیہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے حکم سے مجلس میں شربت انار اور حقہ کشی کا دور چل رہا تھا۔ اور تمام اہل مجلس ان کیفیات سے خوش و خرم ہو رہے تھے اور ہر ایک کسی نہ کسی موضوع پر محو گفتگو تھا اس وقت آں حضرت کپڑا اور سوئی ہاتھ میں لیے ہوئے اپنے سر مبارک کے لیے ٹوپی بنانے میں اس طرح مشغول تھے کہ آپ کی مبارک نظریں صرف کپڑا اور سوئی پر مرکوز تھیں اور دائیں بائیں جانب کی کوئی خبر نہ تھی۔ اتفاق سے آپ کے خادموں میں سے ایک

بود مجنون کہ گاہ گاہ دماغش از حرارت خبطیت
در جوش آمدے برآئنہ در چنیں حال او را از
عقل وشعور فراموش شدہ افعالِ نالائق واقوال
ناصواب از دست وزبانش صادر شدے
واگر عیاذاً باللہ شمشیرے وباخنجر در دستش
عالمے را بفغان آوردے وکسے را زہرۂ آں
نبود کہ بقوت از دست او بگیرد تا بعد از
ساعتے جوش خبطیت او تسکین یافتے آں
زمان خود بخود شمشیر بیفگندے و از کردہ
وگفتہ خویش مستغفر ونادم شدے قضارا
دران مجلس حاضر بود یکایک دماغش برہم
شد تیغے کہ در دستِ داشت از نیام برکشید
وچوں شتر مست کف از دہان برآوردہ بہر
یکے حملہ کردن گرفت چوں اہلِ مجلس بدیں حال
اورا دیدند از ترس وھیبت او بگریختند الاّ
آں سرور از غایت استغراق کہ میداشت سرموے
از شور آن وقت خبردار نشد سر فرو گذاشتہ
ونظر در پیش داشتہ وریختہ زدن کلاہ کہ مشغول
بود ہم چنان خود را در ہمان کار دادہ بود اتفاقاً
چون مردکِ خسیس نہاد دون طبع شاہ
را تنہا یافتہ از تیغ ضرب محکم بر شاہ راند
تا کہ زخمی کارے وجراحتے ہائل بر ذات مبارک
آں حضرت پدید آمد ہم چناں خبرے دیگر چنانکہ
از ضرب آں مردک ہر دو شانہ مبارک آں حضرت

خادم مجنون تھا کبھی کبھی اس کا دماغ گرمی اور
دیوانگی سے جوش میں آجاتا اور وہ عقل وشعور سے
عاری ہو کر اس کی زبان سے اس عالم میں نالائق افعال واقوال
صادر ہوتے۔ اللہ کی پناہ اس وقت اس کے
ہاتھ میں کوئی تلوار یا خنجر مل جائے تو وہ
ایک عالم کو ہلادے کسی میں یہ طاقت نہیں
رہتی کہ ہمت سے اس کے ہاتھ کو پکڑلے! چند
گھنٹوں کے بعد جب اس کی یہ دیوانگی اور جوش
وجنون ختم ہوتا تو اسی وقت تلوار نیچے ڈال دیتا
اور اپنے کئے پہ نادم وشرمسار ہو کر معافی کا خواستگار ہوتا۔
اتفاق سے وہ مرید مذکورہ مجلس میں موجود تھا۔ دفعتاً
اس کا دماغ گرم ہوا اور میان سے تلوار نکال کر مست
اونٹ کی طرح منہ سے کف نکالتا ہوا ہر ایک
پہ حملے کرنا شروع کردیا۔ اس کی اس حالت سے
اہل مجلس پہ خوف وہراس پھیل گیا اور وہ بھاگنے
دوڑنے لگے۔ لیکن اس مجلس میں آپ کی تنہا وہ ذات
گرامی تھی جو اس وقت کے شور وغل اور ہنگامہ سے بالکل
بے خبر سر جھکائے ہوئے اپنی پرانی ٹوپی کو سینے میں
مشغول تھے۔ اور آپ اپنے کام میں مشغول اور منہمک رہے
اس خسیس طبع مرد نے جب شاہ کو تنہا پایا تو
اپنی تلوار سے آپ پہ ایک زبردست وار کیا جس
سے ایک کاری زخم ہو گیا۔

اسی طرح ایک دوسری روایت بھی ہے کہ
اس آدمی کی مار سے آپ کے دونوں بازو

شکستہ خود بقوت تمام شمشیر از دستش
بگرفت و اورا بر زمین کوفت بعد ازاں
از ہر طرف بدویدند از مشت ولکد وسلاق
تادیبے سخت کردند چون آن صاحب قلبِ
رحیم
دید کہ اورا چنین نوع از ضربِ گوناگوں کوفتہ میکند
روی مبارک از غصہ سرخ کردہ بر ہر یکے نعرہ
چنیں زد کہ دست ازو بدارید و در ایذائے
او نکوشید احیاناً اگر کسے از طالبان و
معتقدانِ من از حکمِ من تخلف ورزد و دست
دراز کند پس در روز قیامت یوم
یوخذ بالنواصی والاقدام دستش را از
دامن کوتاہ باشد واز حضوریت من محروم
بمجرد استماع ایں حرف شفقت انگیز ہمہ کسان
دست ازو باز داشتند فا مادست
پر کتفش بستہ پیش دربار آں سید قادری
داشتند از ساعتے آں حضرت حکم فرمودہ
کہ آئینہ بیارید پس آئنہ خوب وصاف
ومربع بدست مجروح مبارک آنسرور دادند
تبسم کناں چوں
گل خنداں در آئنہ نگاہ کردہ چنیں فرمودہ
کہ اے محبوب جانہا وای مطلوب دلہا
جان ودلم فدائی نامت مارا بکسوت کسوۃ
الحمراء علامۃ العروس ملبس نمودہ نظارہ

ٹوٹ گئے تھے اس کے باوجود آپ اپنی پوری
قوت سے اس کے ہاتھ سے شمشیر کو کھینچ لیتے
ہیں اور اس کو زمین پر پچھاڑ دیتے ہیں اتنے میں تمام لوگ
دوڑ کر آگئے اور اسے گھونسا، لات، اور سلاق سے بری
طرح مارنے لگے جب اس منظر کو قلبِ رحیم رکھنے والے
وہ بزرگ نے دیکھا تو فوراً آپ کا چہرہ غصہ
سے سرخ ہو گیا اور بلند آواز سے فرمانے لگے
اپنے ہاتھوں کو روک لو اور اسے تکلیف نہ دو اگر
کوئی بھی میرا طالب یا معتقد میرے حکم کی خلاف
ورزی کرے گا اور دست درازی کرے گا تو
وہ قیامت کے دن یوم یوخذ بالنواصی
والاقدام کے عالم میں میرے
دامن سے وابستہ نہ رہ سکے گا اور میری صحبت
ومعیت سے محروم ہو جائے گا۔ تمام طالبین و
معتقدین نے اس قول کو سنا تو اپنے اپنے ہاتھ روک
لئے اور اس آدمی کے ہاتھ پیر باندھ کر حضرت کے سامنے
پیش کیا۔ اسی وقت آپ نے حکم فرمایا کہ ایک
آئینہ لایا جائے۔ اس کے بعد آپ کے مجروح ہاتھ میں
ایک پاک صاف آئینہ دیا جاتا ہے۔ آپ پھول کی
طرح مسکراتے ہوئے
آئینہ کی طرف دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے جانوں کے
محبوب اور دلوں کے مطلوب میری جان اور دل تجھ پر فدا
اور قربان کیا تو کسوۃ الحمراء علامۃ العروس کے
لباس کو پہنا کر نظارہ کر رہا ہے؟

کنی چوں قضاے من تو بریں نہج واقع است
پس رضاے ماہم دراں مندرج است زہے
شوق وزہے ذوق وزہے فخر وزہے سربلندی
القصہ بارے آں وقت آں حضرت در حرم
سرائے عقب ارادی خود نزول فرمودہ از جابجا
معالجان وجراحت بندان داشت درین
اثنا ناگاہ حاکم آں شہر خادمِ خانوادہ قادری
عبدالوہاب شحنۂ شہر رامعہ موکلان عذاب و
جراحت بندان باصواب و معالجان صداقت مآب
درخدمت آنسرور فرستاد موکلان عقوب را اشارت
داد بترودی آں واجب القتل رامعہ جمیع
توابعان ولواحق او بگونہ عذاب وعقاب
بصحرای عدم رسانید۔ چنین حکم فرمودہ کہ جراحت
آں سرور را بزودی ہرچہ تمام تر مرہم آرند و از
صداقت کمال زخم آں سرور مرہم بکار برند علی
السرع اطال التیام پذیرد چوں شحنہ
معلوم مع وکیلان مرقوم بردرگہ عالی
وارد شد بمجرد رسیدن آں واجب السیاست
را از ضرب سلاق و دکہنا وکشاکش کردن
گرفت ناگاہ در خانقاہ عالی شور عظیم
برخاست اند کہ ازیں واقعہ بسمع ہمایوں آں
آں حضرت رسید از نزدیکانِ خود استفسار
فرمود لیس فرستادن شحنہ وعلاج پردازان
حاذق حاکم شہر من وعن معروض

جب تیری قضا اس نہج پر واقع ہے تو اسی میں
ہماری رضا وخوش نودی بھی ہے۔ زہے
شوق زہے ذوق زہے فخر، زہے سربلندی
حاصلِ کلام! اسی وقت آپ خود سے اپنے
حرام سرائے کے پیچھے چلے گئے۔ جہاں پر طبیبوں اور زخم
پر پٹی باندھنے والے موجود تھے۔
اچانک اس درمیان اس شہر کا حاکم، خانوادۂ قادری
عبدالوہاب نامی شہر کے کتوال کو چند موکلان و
جراحت بندان اور معالجوں کے ساتھ آپ کی
خدمت میں روانہ کیا اور اس نے سزا دینے والے
مؤکلین کو حکم دیا کہ اس واجب القتل کو اور
اس کے پیروکار اور لواحقین کو قسم قسم کی سزائیں
دے کر صحرائے عدم میں پہنچادیں نیز یہ حکم
بھی دیا کہ جتنا جلد ہوسکے مرہم کو کام میں لایا جائے
اور آں سرور کا زخم جلدی سکھادیں، جب کوتوال
اپنے ساتھیوں کے ساتھ درگاہِ عالی میں حاضر ہوا
اور اس واجب السزا مجرم کو سلاخ اور قمچی
وغیرہ سے مارنا شروع کیا۔
اچانک خانقاہ عالیہ میں شور وغل بلند ہوا تو یہ
خبر حضرت کے گوش مبارک تک پہنچی۔ اپنے پاس
جو لوگ تھے ان سے آپ نے حالات دریافت فرمایا تو
معلوم ہوا کہ حاکم شہر کوتوال اور طبیب حاذق کو آپ
کی خدمت میں روانہ کیا ہے صرف یہ لفظ سننا ہی تھا
غصہ سے رخسار مبارک سرخ ہوگیا اور حاکم کے بارے میں

خدمت النوابیت پناہ داشتند بمجرد استماع
این حرف رخسارہٗ مبارک از غصہ سرخ شد
وحاکم را بسیار سخت گفتن آغاز کرد و بدست
خادمے گفتہ فرستاد کہ ای فلان شنیدہ ام
کہ سحنہ شہر را مع وکیلان عقاب کہ بر در من
فرستاد محض از پئے ایذای این جراح بیچارہٗ
من است کہ تا مع توابعان او را بشہرستان
عدم رسانند زنہار ترا درمیان این کار آمدن
ودعویٰ خون ما کردن چہ مناسب الحق دعویٰ
خون پدر بر پسر واجب است و یا از کسے
اولیای مقتول ولتو از ینہا
نہ بہیچ وجہ در سلک قرابت منسلک نیستی
ونیز حکم فرمودہٗ کہ این بیچارہ را مع عیال واطفال و
با خاک یکسان کنند مگر کلام مجید نہ خواندہٗ ولا تزر و
زمۃ وزر اخری زنہار فعل بکہ در یوم یوخذ بالنواصی
والاقدام مواخذ ومعاتب باشی از قوت بفعل میاد خون
ناحق این بیگناہان بگردن خود مسپار۔ الحق خطائیکہ
ازان بیچارہ واقع شدہ سہو است نہ عمدًا وچون گاہ گاہ
عارضہ از شوریدگی دماغ وخفقان دل یا و پیدا شدہ در آں
حال بے اختیاری چنیں امرہائے شنیع از و واقع می شود و
مہرگاہ از چنیں کس درچنیں وقت چنیں امرہا صادر می گردد
در شرع شریف او را معذور میدارند کہ المجنون
مرفوع القلم پس آن نہادم بہمیں نوع بر حکم فرمودہٗ
آن رحیم دل حلیم

سخت کلامی شروع کی اور اپنے ایک خادم کے ذریعہ
کہلا بھیجا کہ اے فلاں میں نے سنا ہے کہ تم
نے اپنے شہر کے کوتوال اور معاونین کو میرے
دروازے پر روانہ کیا ہے۔
اور محض میری تکلیف اور مجھ بے چارے
کے لیے یہ اقدام کیا ہے کہ مجرم کو اسکے خاندان کے ساتھ
قبرستان بھیج دے۔ تجھے اس معاملہ میں
ہمارے خون کے بدلے کا دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے۔
حق تو یہ ہے کہ بیٹے پر اپنے باپ کے خون کا دعویٰ
کرنا واجب ہے یا مقتول کے کسی سرپرست کو
یہ استحقاق حاصل ہے۔
اور تو کسی طور پر میری قرابت سے منسلک اور وابستہ
نہیں ہے۔ اور تو نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ اس کو اس کے
اہل وعیال کو مٹی برابر کر دے۔ کیا تو قرآن مجید
نہیں پڑھتا ولا تزر وازرۃ وزر اخری ضرور بضرور جو
کام تو کرتا ہے قیامت کے دن یوم یوخذ بالنواصی والا
قدام کے تحت مواخذہ وعتاب میں مبتلا رہے گا لہذا
تو اپنی قوت وطاقت سے ایسا کام نہ کر کے ان بیگناہوں
کے خون ناحق کو اپنی گردن پر ڈالے۔ حق تو یہ ہے
کہ اس بے چارہ سے جو غلطی سرزد ہوتی ہے وہ بھول
کر ہوئی ہے نہ کہ جان بوجھ کر۔ کیوں کہ اس کے دماغ کی
شوریدگی اور دل کی گھبراہٹ سے یہ واقعہ پیش ہوا ہے
اور وہ اپنے اختیار سے باہر ہونے کی وجہ سے ایسے معاملے
اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ایسے افراد کو شریعت بھی معذور
قرار دیتی ہے لہذا اس واقعہ کو میں المجنون مرفوع القلم
پر محمول کرتا ہوں اسی طرح آپ صاحب رحیم دل وحلیم کی

این تقریر پُر فصاحت بے کم وکاست بحضور آں دولت مندا دا نمودہ از حلم آں سرور و رضا دادن بقضائے الٰہی بغایت تعجب ماند بارے در اندیشۂ دور و دراز افتاد

پُر فصاحت تقریر کو بے کم وکاست اس حاکم تک پہنچا دیا گیا۔ حضرت کی بردباری اور قضائے الٰہی سے آپ کی خوشنودی کے اظہار سے خود حاکم حد درجہ تعجب میں پڑ گیا اور ذہن سے سزا دینے کی بات کو نکال دیا۔

قصائدِ ذوقی قسط نمبر

قصیدہ در مدحِ حضرت علی کرم اللہ الکریم

ترجمہ
از ڈاکٹر وحید اشرف
مدراس یونیورسٹی
مدراس

۱۔ شہِ عالی افسر توئی یا علیؓ — سرِ کشور افسر توئی یا علیؓ
بادشاہِ عالی افسر آپ ہی ہیں یا علیؓ — ملکِ دیں کے شوکت و فر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۲۔ خیلِ بزرگانِ روشن نفس — توئی یا علیؓ سر توئی یا علیؓ
ہیں جو سارے اولیائے دین اور روشن نفس — سب کے شاہ و سردر و سر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۳۔ بہ تیغِ درخشانِ چوں آفتاب — سر اندازِ صفدر توئی یا علیؓ
آپ کی تیغِ درخشاں ہے مثالِ آفتاب — سب کو ہے معلوم صفدر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۴۔ پس از جامعِ مُصحفِ ذوالمنن! — شہِ عالی افسر توئی یا علیؓ
حضرتِ عثمانِ غنی جامعِ مصحف کے بعد — بادشاہِ عالی افسر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۵۔ کفت ہمچو دریا دِلت ہمچو کان! — چوں گوہر بگوہر توئی یا علیؓ
آپ کا کف مثلِ دریا، آپ کا دِل مثلِ کان — سر سے پا تک پُر ز گوہر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۶۔ دُرِّ بحرِ حلمی، درِ شہرِ علم — بشوکت فراخور توئی یا علیؓ
آپ دُرِّ بحرِ حلم اور آپ بابِ شہرِ علم — شان و شوکت کے فراخور آپ ہی ہیں یا علیؓ

۷۔ وثاقِ خرد را ز روی کمال — باہلِ خرد، در توئی یا علیؓ
ہے کمالِ عقل کا جو شہر اس کی دید کو — کہتے ہیں اہلِ خرد، در آپ ہی ہیں یا علیؓ

۸۔ چرا سوی بحری کنم التفات — چو در جود ابحر توئی یا علیؓ
سوئے دریا کیوں کروں میں التفات اے بادشاہ — فیض کا جاری سمندر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۹۔ بمانند ابر از کرم دُرفشاں — بحر و بر اظہر توئی یا علیؓ
آپ کا ابرِ کرم برساتا ہے لعل و گہر — بحر و بر پہ فیض گستر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۰۔ بجنبش دلیراں ہمچون شیر بر — امیرِ مظفر توئی یا علیؓ
لشکرِ جرّارِ اعدا ہو کہ ہو شیروں کی بھیڑ — فاتح و غالب، مظفر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۱۔ بشوکت سلیمان والا سپہر — بمکنت سکندر توی یا علیؓ
شان وشوکت میں سلیمانِ جہاں ہیں آپ ہی — وقت کے اپنے سکندر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۲۔ اورنگ اجلال اکلیل فضل — شہ دادگستر توی یا علیؓ
شاہِ عالی مرتبہ ہیں فضل کے اورنگ پر — بادشاہِ عدل گستر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۳۔ پی رفع ظلماتِ فسق و فجور، — سنای مصوّر توی یا علیؓ
دُور کرنے کے لیے تاریکیٔ فسق و فجور — روشنی کا ایک پیکر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۴۔ خداوندِ جاہ و خداوندِ راہ — بدینِ پیمبر توی یا علیؓ
آپ شاہِ جاہ بھی ہیں اور شاہِ راہ بھی — راہبرِ دینِ پیمبر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۵۔ زگمراہی اندر طریقِ ہُدیٰ — فتر سم کہ رہبر توی یا علیؓ
دیکھ لی راہ ہدایت گمرہی کا خوف کیا — راہ میں جب میرے رہبر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۶۔ غضنفر فری شاہ حیدر دری — بلند افسر سر توی یا علیؓ
اے غضنفر اور اے میرے شہِ حیدر — سرورانِ دین کے افسر آپ ہی ہیں یا علیؓ

۱۷ منم بندۂ کمترِ احقرت ! — کرم کُن کہ داور توی یا علیؓ
کیجیے اپنا کرم اس بندۂ احقر پہ بھی — میں ہوں بندہ اور داور آپ ہی ہیں یا علیؓ

۳۷۔ قصیدہ در مدح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

۱۔ دلبر ماہ پیکری، وز قدخوش صنوبری — گرچہ تمام فتنہ ای، دور مشو کہ غم بری
تو ماہِ پیکر دلبر ہے اور خوش قامتی میں صنوبر ہے — اگرچہ تو تمام فتنہ ہے، لیکن دور نہ ہو کیوں کہ تو غم کو دور کرنے والا بھی ہے

۲۔ درصدفِ جمال وحُسن، نیست غلط کہ گوہری — از رُخ ہمچو آئینہ گوی برصنم بری
حسن کے صدف میں تو ایک موتی ہے اور اپنے آئینے کے — مانند چہرے سے صنم پر بھی سبقت لے جاتا ہے

۳۔ تشنہ لبانِ عشق را، آبِ زلالِ کوثری — ظلم مکن بدل گرای، جانِ بہ پناہِ حیدری
عشق کے پیاسوں کے لیے تو کوثر کا آبِ زلال ہے — ظلم نہ کر اور میرے دل میں آجا یہاں تو حیدر کی پناہ میں

ہے گا (یعنی تجھ سے ظلم کا بدلہ نہیں لیا جائیگا)

۴۔ شاہِ جہان، علی کہ ہست یکہ بداد گستری — پیشِ حسام او طعم گشتہ مُقرِ بآذری!

شاہِ جہان علی جو عدل کرنے میں بے مثل ہیں اور اُن کے نیزے کے سامنے غذا اقرار کرنے لگتی ہے کہ یہ نیزہ آگ ہے۔ (یعنی نیزہ کی غذا اعداء ہیں جنھیں اپنی آگ سے جلا دیتی ہے۔)

۵۔ تازہ زآب یادِ او باغِ دلِ صنوبری — اے شہِ آفتابِ دل حی دری و حیدری

صنوبری دل کا باغ اُن کی یاد کی آب سے تازہ ہے۔ اے دل کے آفتاب کے بادشاہ آپ زندہ دروازہ ہیں اور حیدر بھی ہیں۔

۶۔ خاکِ درِ تو سرورا فسرِ فرقِ سروری — بستہ فلک بہ پیشِ تو شاہِ فلک بچاکری

اے سرور آپ کے در کی خاک بادشاہی کے سر کا تاج ہے۔ آسمان نے اپنے بادشاہ یعنی سورج کو آپ کی نوکری پر مقرر کر دیا ہے

۷۔ پیشِ تو ماندہ رستمی، رستم مہ بداوری — دادگرِ یگانہ ای، پادشہِ مظفری

رستم آپ کے سامنے عدل اور بہادری میں ریت کا بنا ہوا رستم ہے۔ آپ بے مثل عادل ہیں اور فاتح بادشاہ ہیں۔

۸۔ پیشِ تو بہر بندگی خم شدہ چرخِ چنبری — جام سحر در آمدہ، در کفِ تو بساغری

چرخِ چنبری بندگی میں آپ کے سامنے جھکا ہوا ہے، صبح کا جام آپ کے ہاتھوں کے لیے ساغر ہے۔ (سورج کو ساغر کہا ہے)

۹۔ مدح تو چوں کنم شہا کز سرِ وصفِ برتری — شاہِ فلک بمحفلی، از رہِ جود گستری

اے شاہ آپ کی مدح کس طرح کروں کیوں کہ جو اوصاف میں بیان کروں گا آپ میرے بیان سے برتر ہیں۔ محفل میں، فیّاضی میں آپ آفتاب ہیں۔

۱۰۔ ہمچو غضنفری شہا در مصف از دلاوری — ہست سزای چوں توئی حیدری و غضنفری

میدان جنگ میں آپ دلاوری میں شیر ہیں۔ حیدری اور غضنفری آپ ہی کو زیب دیتی ہے۔

۱۱۔ چوں سگِ لاغری بود دشمن توز منکری — شد بغلامیت مقر انس و جنی و پری

دشمن آپ کے انکار کے سبب لاغر کتّے کی طرح ہو جاتا ہے انس، جنّ و پری آپ کی غلامی کے معترف ہیں۔

۱۲۔ شاہِ سریر رفعتی، از خور و ماہ برتری — کردہ بحلقِ دشمنت، تار و شاخ خنجری

اے بلند مرتبہ بادشاہ آپ سورج و چاند سے برتر ہیں۔ دشمن کے حلق میں آپ نے خنجر کی پٹی کا تار ڈال دیا ہے۔

۱۳۔ پا ز بر فلک نہد، بندۂ تو بقیصری — انوری از ثنای تو، بندۂ تو شاہ انوری

آپ کا غلام قیصری میں آسمان پر پاؤں رکھتا ہے۔ آپ کی ثنا کے سبب انوری کو مقامِ بندگی ملا۔ آپ شاہ انور ہیں۔

۱۴۔ ذوقی دون غلام تست، او را بہ رحم بنگری — ہم تو عزیز کن ورا چون شہ مکرمت وری

کمترین ذوقی آپ کا غلام ہے اس پہ رحم کیجیے۔ اُسے ہر دلعزیز بنا دیجیے کیوں کہ آپ عزت و کرم والے بادشاہ ہیں۔

۱۵۔ تا فلک است زیب ور از رخ شاہ خاوری — نام تو باد زیب دین فر تو زیور سری

جب تک سورج آسمان کو زیب دیتا ہے۔ آپ کا نام زیب دین رہے اور آپ کی شان دین کی سروری کا زیور ہے

۱۶۔ روی ولیت منجلی ہمچو قمر ز اقمری — روی عدوی منکرت زرد چون ز رشش مری

آپ کے دوست کا چہرہ چاند کی طرح روشن رہے اور آپ کے منکر دشمن کا چہرہ زرِ خالص کی طرح زرد رہے

۳۸۔ قصیدہ در مدح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

۱۔ ای عالی افسر شاہ مظفر — از تاب تیغت گردون پُر آذر

اے بلند رتبہ فاتح بادشاہ آپ کے تیغ کی تاب سے آسمان آگ سے بھر گیا ہے۔ (آذر یعنی آگ سے اشارہ ستاروں کی طرف ہے)

۲۔ گر خنجر تو تابد بگوھر — در آذر یم گردد سمندر

اگر آپ کا خنجر موتی پر چمکے تو اس کے اثر سے موتی دریا کی آگ کا کیڑا (سمندر) بن جائے

۳۔ از ابر کفت ای دادگستر — پُر از دُر رشد ھم بحر وھم بر

اے عدل قائم کرنے والے بادشاہ آپ کی ہتھیلی کے بادل سے بحر و بر موتیوں سے بھر گیا ہے۔

۴۔ لو گر بر کشای در بیشہ خنجر — یک قطرۂ نم گردد غضنفر

اگر آپ جنگل میں خنجر کشای کریں تو جنگل کا شیر پگھل کر پانی کا ایک قطرہ بن جائے۔

۵۔ دریای جودی، موج تو ابحر — رائ تو روشن لمعان او خور

آپ فیاضی کا سمندر ہیں، جس کی ہر موج ایک بحر ہے آپ کی رائے روشن ہے اس کی چمک سورج ہے۔

۶۔ از صدمۂ نوای شاہ داور — چون پر بعاصف سدِ سکندر

اے عادل بادشاہ آپ کے خوف سے سدِ سکندری ایک پر کی طرح خم ہے۔

۷۔ در بندگانت دارا و قیصر — در چاکرانت محمود و سنجر

دارا و قیصر اور محمود و سنجر آپ کے نوکروں میں ہیں۔

۸۔ گر گرز کوبی بر کوہ و کر در گاوِ زمین را پُر خوں شود سر

اگر کوہ و کردر پر آپ اپنا گُرز ماریں تو گاوِ زمین کا سر خون سے لہولہان ہو جائے۔

۹۔ خاک تو شاھا بر جای افسر برفرق دارد سلطانِ خاور

اے بادشاہ آپ کے پاؤں کی خاک کو مشرق کا بادشاہ یعنی سورج اپنے سر پر رکھتا ہے۔

۱۰۔ غم در زمانت معدوم یکسر برجای لُقطہ موجود کر در

آپ کے زمانے میں غم یکسر معدوم ہے اور جہاں کہیں لُقطہ ہے وہاں اس کی حفاظت کے لیے کرد موجود ہوگیا

۱۱۔ از دستِ لطفت ای معدنِ فر شد لعل حمرا ہر روی چوں زر

اے شان و شوکت کے معدن آپ کے دستِ کرم سے ہر وہ چہرہ جو غم سے زرد تھا اب خوشی سے سُرخ ہو گیا ہے۔

۱۲۔ چوں خونِ اعدا ریزی زخنجر آید عدم را قر قف بساغر

جب آپ خنجر سے اعداء کا خون بہاتے ہیں تو فوت اعدا کے خون پی کر نشہ سے مست ہو کر لغزیدہ ہو جاتی ہے

ساغر میں شراب کی لغزش اسی سبب سے ہے۔

۱۳۔ از ہیبت تو بر چرخِ اخضر چوں ماہ کاہد خورشیدِ انور

سبز آسمان پر آپ کی ہیبت سے خورشید انور چاند کی طرح گھٹ جاتا ہے۔

۱۴۔ کفِّ تو باشد جود مصوّر رأیِ تو باشد چوں خور منوّر

آپ کی ہتھیلی فیاضی کا پیکر ہے۔ آپ کی رائے سورج کی طرح روشن ہے۔

۱۵۔ از تابِ تیغت اعدای منکر چوں چوب ز آتش گردید اخگر

آپ کی تیغ کی چمک سے منکر اعداء اس طرح چنگاری بن گئے جیسے لکڑی آگ سے جل کر چنگاری

پیدا کرتی ہے۔

۱۶۔ از خیبر کشتی چوں آتشِ شر آسودہ عالم در عہدت ایسر

چوں کہ آپ نے خیبر سے شر کو قتل کر دیا اس لیے آپ کے عہد میں عالم آسودہ ہے۔

۱۷۔ از تا مکرمت را کردی مشتہر در دست تشنہ نم گشتہ آذر

جب سے آپ نے فضل کو عام کر دیا ہے، پیاسے کے ہاتھ میں آگ بھی پانی بن جاتی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ

علمی، دینی، اصلاحی اور معلوماتی